نوید ظفر کیانی

بسم الله الرحمن الرحيم

نوید ظفر کیانی

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

http://naveedzafarkiani.wordpress.com
www.facebook.com/nzkiani

خواب دیکھنے والوں کے نام

ایک محفل سے جمائے رہتے ہیں
محفلِ شب کے دئے میں اور چراغ

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام	میں اور چراغ۔
شاعر	نوید ظفر کیانی۔
وضاحت	یہ نوید ظفر کیانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔
کاپی رائٹ	
اجازت	
صفحات	۲۰۶
سالِ اشاعت	۲۰۲۰ء
سنِ اضافہ	۲۰۲۰ء
پبلشر	نوید ظفر کیانی۔
ویب سائٹ	http://naveedzafarkiani.wordpress.com
فیس بک	http://www.facebook.com/nzkiani
برقی ڈاک	nzkiani@gmail.com

ترتیب

حمد باری تعالیٰ

ہر اک زماں پہ شانِ نظامت کے دستخط
ہم آپ کیا ہیں اُس کی حقیقت کے دستخط

سُن لیتا ہے وہ میری کہی اَن کہی سبھی
چاہتا نہیں کسی کی شہادت کے دستخط

ستر شفیق ماؤں سے بڑھ کر شفیق وہ
سارے جہان پر ہیں محبت کے دستخط

آزاد ہے وہ ہر اک زمان و مکان سے
سب ساعتوں پہ اُس کی رفاقت کے دستخط

ہر کائنات پر ہیں نئے جستجو کے باب
اور ہر افق پہ تازہ اشارت کے دستخط

ماتھے کے سب نقوش اُسی کی گواہیاں
ہر اک سرِ خمیدہ اطاعت کے دستخط

وہ آپ ڈھونڈ لیتا ہے فائل حیات کی
ہر لمحہ ہیں تلاش میں رحمت کے دستخط

ہر آئینے پہ کھل گیا بابِ قبولیت
ہر اک دعا پہ دیکھے بشارت کے دستخط

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

اُنڈیلوں گا دل و جاں بھی قلم کی روشنائی میں
تو حسبِ حق نہ لکھ پاؤں گا شانِ مصطفائی میں

میں اُنؐ کے عشق کی رہداریوں میں خود کو کھو آیا
یہی رستہ نظر آیا مجھے رب تک رسائی میں

جو اُنؐ کی نسبتیں پائیں تو گویا پا لیا سب کچھ
زمانوں نے بنایا مستقر میری اکائی میں

وہؐ جس پر بیٹھ کر خود آگہی کا درس دیتے تھے
زمین و آسماں کو جذب دیکھا اُس چٹائی میں

اِسی باعث تو محبوبِ خدا سے لو لگائی ہے
کہ رہنا چاہتا ہوں میں بھی قربِ کبریائی میں

جنوں کا رنگ دیکھا ہے، خرد کا روپ پایا ہے
بہ شکلِ عشق ہے جیون، محمدؐ کے فدائی میں

مدوّن نامۂ اعمال ذکرِ مصطفیٰؐ سے ہے
قیامت کو یہی سرمایہ تو ہو گا صفائی میں

رحمتِ عالم ﷺ

تجھ جیسا کوئی تھا، نہ کوئی ہے، نہ ہی ہو گا
تو خالقِ یکتا کی ہے اِک کاوشِ یکتا
تو رب کا ہے اِک خاص کرم رحمتِ عالم

سب جزو سمٹ جاتے ہیں جس میں، تو وہ کل ہے
تو ختمِ رُسل، ختمِ رُسل، ختمِ رُسل ہے
دائم ہے تری ذات کا نم، رحمتِ عالم

تو مکہ مدینہ میں مقید تو نہیں ہے
دریائے محبت پئے سرحد تو نہیں ہے
یہ سارا ہی عالم ہے حرم رحمتِ عالم

ہر لمحہ فروزاں تیرے افکارِ جلی سے
ہر دور ہے گلزار اِسی ایک کلی سے
صدیوں پہ ترے نقشِ قدم، رحمتِ عالم

اِک فلسفۂ جذب و وفا ہے یہ ہمارا
جو رب کا ہے پیارا تو وہ پھر سب کا ہے پیارا
تیرے لئے سب لوح و قلم، رحمتِ عالم

ہر ایک مسلمان ترا نعرہ ہے گویا
ایمان ترے نام کا نقارہ ہے گویا
ہم لوگ سبھی تیرے علم، رحمتِ عالم

بے مثل ہے اُمت کے لئے تیری محبت
اِک حشر کے دن تجھ سے ہے اُمیدِ شفاعت
ہم جیسوں کا رکھے گا بھرم رحمتِ عالم

کیسی تنہائی میں تھے میں اور چراغ
رات بھر جلتے رہے میں اور چراغ

وقت کی سانسیں بگولوں کی طرح
فرش پر اُڑتے سمے میں اور چراغ

ایک محفل سی جمائے رہتے ہیں
ظلمتِ شب کے گلے، میں اور چراغ

رات کے لمبے سفر کا سلسلہ
اَن دِکھے سے راستے، میں اور چراغ

اِک تھکن ہر سمت سے رستی ہوئی
تیری یادیں، رتجگے، میں اور چراغ

سسکیاں لیتی ہوا کی بازگشت
قرنوں کی چپ میں گھرے میں اور چراغ

کھڑکیوں پر برف سی سوئی ہوئی
اور اندر جاگتے میں اور چراغ

ساتھ تھا اِک ہجر کا آسیب سا
کن ہواؤں سے لڑے میں اور چراغ

تھرتھرائی تھیں لویں کچھ دیر کو
آخرِ شب بجھ گئے میں اور چراغ

رات تو آخر گزر جانی ہی تھی
کچھ تو اپنا سوچتے میں اور چراغ

کھیلتے رہتے ہیں آپس میں ظفرؔ
آہٹوں کے اژدھے، میں اور چراغ

ہمارے سوزِ دروں کی اُسے طلب بھی تو ہو
کسی پہ جان لٹانے کا کچھ سبب بھی تو ہو

بس اُس کو رسمِ زمانہ ہے مستقیم صراط
غرورِ عشق میں کچھ میرا ہم نسب بھی تو ہو

بہت ضروری ہے شب زادوں سے جوابدہی
سحر کے وقت مگر تذکرۂ شب بھی تو ہو

نہیں ہے دور جہاں بھر کی شہریت ہم سے
فصیلِ شہر کسی کے لئے عجب بھی تو ہو

یوں ترکِ عشق تو آساں دکھائی دیتا ہے
سے کسی کو بھلانے کا آئے، تب بھی تو ہو

سخن کو سود و زیاں کا رہین کیا کرنا
جو تیرے دل میں ہے وہ ہمکنارِ لب بھی تو ہو

یہ میرا روگ نہیں کوئی خاص پیچیدہ
مرے لئے ترے نینوں کا واسطہ بھی تو ہو

میرا وطن ہے پاکستان

جہاں میں رشکِ باغِ عدن ہے پاکستان
بہارِ حسن کی دائم پھبن ہے پاکستان
مشاطگی کا عجب بانکپن ہے پاکستان
نظیر جس کی نہیں، وہ چمن ہے پاکستان
مجھے ہے فخر کہ میرا وطن ہے پاکستان

یہ وہ زمین ہے جس سے فلک کے ناتے ہیں
یہیں پہ ہست کے سب رنگ مسکراتے ہیں
اِسی کی خاک میں سورج اُگائے جاتے ہیں
دیارِ خوب کی گویا لگن ہے پاکستان
مجھے ہے فخر کہ میرا وطن ہے پاکستان

یہ پاک دھرتی تو سجدہ گہِ زمانہ ہے
نمود ہو کہ وجود اِس کا، معجزانہ ہے
اِسی کے نام تب و تابِ جاودانہ ہے
ابد کی لوح پہ لکھا سخن ہے پاکستان
مجھے ہے فخر کہ میرا وطن ہے پاکستان

لبوں پہ گیت اسی کی محبتوں کے رہیں
نظر میں سلسلے روشن مسافتوں کے رہیں
لہو میں زمزمے ہردم عزیمتوں کے رہیں
مری رگوں میں بھی اب موجزن ہے پاکستاں
مجھے ہے فخر کہ میرا وطن ہے پاکستان

میں کہاں ہوں، اپنے ہونے کا گماں ہوتے ہوئے
قفل یہ کھلتا نہیں ہے چابیاں ہوتے ہوئے

گویا میرے ظرف پر تحقیق لازم ہو گئی
کس طرح خندہ رہا بارِ خزاں ہوتے ہوئے

ناچتی ہے جھاڑیوں سے رِستی آنکھوں کی ہوس
سب شکاری ہیں یہاں مرغابیاں ہوتے ہوئے

اِتنے دریاؤں کے ہوتے تیمز کے پیاسے ہیں کیوں
بے زباں ہیں کس طرح اہلِ زباں ہوتے ہوئے

آگ سے یوں کھیلنے کا شوق مہنگا ہے بہت
اِس طرح قدموں تلے آتش فشاں ہوتے ہوئے

یہ جہانِ ہست ہو جیسے کوئی جادو نگر
لوگ سارے اُڑتے جاتے ہیں دُھواں ہوتے ہوئے

سر پھوڑے حوصلوں سے پوچھنا بنتا تو ہے
اِس قدر محدود کیوں ہیں بیکراں ہوتے ہوئے

مغویٔ دل کی رضا کیا، عہدِ ترکِ عشق کیا
خود سے ناواقف ہوں اپنا رازداں ہوتے ہوئے

اُڑنے کی رُت آئے تو اُڑ جاتے ہیں پنجروں سمیت
کب پرندے ٹھہرتے ہیں سختیاں ہوتے ہوئے

اِس لئے ساری کہانی کو نہ اوڑھا، کیا خبر
داستاں تبدیل ہو جائے بیاں ہوتے ہوئے

میری افتادِ طبع نے کس طرح مانا ظفرؔ
تجھ میں ڈھل جاؤں میں رنگِ دیگراں ہوتے ہوئے

آدمی ناآدمی کی جون میں ہے اِن دِنوں
جیسے آشفتہ سری تو خون میں ہے اِن دِنوں

گڑبڑا رکھی ہیں سب کرداروں نے اپنی حدیں
ہر کہانی نشۂ افیون میں ہے اِن دِنوں

آگہی کہ جو نصابِ گمرہی سے اخذ ہے
زندگی کے لازمی مضمون میں ہے اِن دِنوں

تیری یادوں سے مسخر خنکیِ ایام ہے
کچھ سوا گرمی تری اِس اُون میں ہے اِن دِنوں

معرکے ایسے تو رن میں بھی رہے ہیں کب بپا
جو لڑائی قریۂ مامون میں ہے اِن دِنوں

ہر طرف تنہائیوں نے سحر ہے پھونکا ہوا
کل کی یہ جنسِ گراں پرچون میں ہے اِن دِنوں

عشق کی بے باکیوں سے کچھ توازن ہی سہی
بے نیازی عشق کے قانون میں ہے اِن دِنوں

کیوں اُتر جاتے ہوسُن کر چُپ کی اندھی قبر میں
وارِس کوئی تو اُس کے فون میں ہے اِن دِنوں

ہوس پرستوں پہ اب کس کا زور، مجبورؔ
شکار ہوتے رہے ہیں تلور مجبورؔ

ضروری ہو گیا ہوں بہر رونقِ محفل
سو میری عرض پہ ہوتا ہے غور مجبورؔ

کھلا ہوا کوئی دروازہ نہ نظر آیا
بسا کے لے گیا دل میں لاہور مجبورؔ

تمھارے بعد یہ آنکھیں تھیں برہنہ کب سے
پہن لیا ہے کوئی خواب اور مجبورؔ

بنوں میں آ گئے انسان اژدھوں جیسے
چلے گئے ہیں یہاں سے چکور مجبورؔ

میں کیسے ٹوٹنے دیتا کسی وفا کا بھرم
چنانچہ بن گیا ہوں زہر خور مجبوراً

لبوں کو سی کے بھی میں بے نوا کبھی نہ ہوا
رِسے ہی جاتی ہے انگلی کی پور مجبوراً

دل و دماغ میسر نہ ہونے دیتے تھے
بنا رہا ہوں خود اپنا ہی چور مجبوراً

یہ ہجرتیں مجھے کب سے اُڑائے پھرتی تھیں
سو اپنے ہاتھ میں لے لی ہے ڈور مجبوراً

کسی صدا میں کوئی معنی نہ ملے تو ظفرؔ
سنا گیا ہے مری چپ کا شور مجبوراً

کوئی طوفاں یہی دیکھتا رہ گیا
کس کے ہاتھوں میں اب کے دیا رہ گیا

تیرے بدلے سے انداز کا کیا گلہ
میں بھی خود سے کہاں آشنا رہ گیا

ہائے بس ایک ہی شب کا وہ خواب تھا
میری اک عمر کو چاٹتا رہ گیا

مار ڈالا ہے تشنہ لبی نے مجھے
تیرا مشکیزۂ جاں بھرا رہ گیا

گویا اُس نے کتابیں پڑھی ہی نہیں
پھول میں نے دھرا تھا، دھرا رہ گیا

اُنگلیاں ساری میری طرف اُٹھ گئیں
سارے اچھوں میں اِک میں بُرا رہ گیا

جن کو جھلسا دیا وقت کی دُھوپ نے
اپنے سائے میں اکثر کھڑا رہ گیا

یاد آئی نہ اکثر کوئی بھی دعا
ہاتھ میرا اُٹھے کا اُٹھا رہ گیا

ہر طرف سے تو پھر آئے ہیں راہرو
کس سفر کے لئے راستہ رہ گیا

آئینے کو بھلا اِس سے کیا ہے غرض
کتنے عکسوں میں کوئی بٹا رہ گیا

ٹوٹے گی زنجیر

مانا، آج تو وادی کا چہرہ ہے بے تنویر
سورج نکلے گا۔۔۔گو اس میں ہے تھوڑی تاخیر
سب کا ایماں ہے، وادی کی بدلے گی تقدیر
ٹوٹے گی زنجیر
بالآخر
ٹوٹے گی زنجیر

جذبے آہنی باڑوں سے بھی روکے جا سکتے ہیں؟
خواب کبھی زنجیروں میں بھی جکڑے جا سکتے ہیں؟
کب تک زنداں بنی رہے گی وادیٔ کشمیر
ٹوٹے گی زنجیر
بالآخر
ٹوٹے گی زنجیر

جبرِ مسلسل سے کب جنتا دبتی ہے اب کے
صوتِ آزادی کچھ اور بھی اونچی ہے اب کے
خاموشی بھی بن کر گونجے نعرۂ تکبیر
ٹوٹے گی زنجیر
بالآخر
ٹوٹے گی زنجیر

کب تک سوختہ سامانی ہے، کب تک ہے لاچاری
اِن شاء اللہ، آگ یہی بن جائے گی پھلواری
اِسی خرابے سے اُٹھے گی ایک نئی تعمیر
ٹوٹے گی زنجیر
بالآخر
ٹوٹے گی زنجیر

خود کو تنہا نہ یک ڈگر دیکھا
ہر بگولے کو ہمسفر دیکھا

دشمنوں میں گھرا ہوا تھا میں
آئینہ خانے میں جدھر دیکھا

اُف کسی کی جدائی کا منظر
دیکھ سکتا نہ تھا، مگر دیکھا

جانے والے کہیں ملے ہی نہیں
سب ستاروں کو کھوج کر دیکھا

خس و خاشاک کی طرح لے اُڑا
آندھیوں نے نہ بال و پر دیکھا

کہیں نزدیک ہی کنارہ تھا
ڈوب جانے سے پیشتر دیکھا

صورتِ آب ذائقہ نہ ملا
گھونٹ اُمید کا بھی بھر دیکھا

کیا علاجِ وقت ہو گا روشنی سے اب کوئی
منظروں کو لگ گیا ہے عارضہ شب کوئی

مکتبِ دنیا میں پڑھ لیتے علومِ مصلحت
سیکھ لیتے زندگی کر لینے کا بھی ڈھب کوئی

جب کبھی درکار ہو یاروں کو تصدیقِ وفا
چپکے چپکے مسکرا دیتا ہے زیرِ لب کوئی

کیا خبر ہر آدمی کیوں بن گیا آتش فشاں
نفرتوں کا درس تو دیتا نہیں مذہب کوئی

اب محبت کو بھی کہہ سکتے نہیں بے لوث ہم
کھینچتا ہے باہمی اطراف کو مطلب کوئی

راستہ کھوٹا کیا کرتی نہیں اِک گمرہی
آگہی نے بھی دکھانا ہے ہمیں کرتب کوئی

مجھ کو راہوں میں بچھا سکتا ہے نامِ عشق پر
چھین سکتا ہے یوں میری ذات کا منصب کوئی

کتنی ہی آنکھوں کے پتھر آ کے لگتے ہیں اُسے
آئینہ خانے میں جانے لگتا ہے جب جب کوئی

گھر سے نکلے ہیں اگر اُس کے بھروسے پر ظفرؔ
رہرؤں کا بھی وسیلہ کر ہی دے گا رب کوئی

تری جانب کے رستے ٹوٹتے ہیں
یا دیرینہ حوالے ٹوٹتے ہیں

حقیقت ہے یا پتھر ہیں الٰہی!
مری آنکھوں کے سپنے ٹوٹتے ہیں

دلوں کے سلسلے اہلِ دلاں میں
ہمیشہ ہی سے بنتے ٹوٹتے ہیں

پھٹی آنکھوں سے مت دیکھو کسی کو
یونہی تو کچے دھاگے ٹوٹتے ہیں

وہ ہم سے کتنے رشتوں میں جڑے ہیں
ہم اکثر جن سے مل کے ٹوٹتے ہیں

بجا ہے بے قبا اشجار کا غم
خزاؤں میں تو پتے ٹوٹتے ہیں

یہ کیسی آہٹیں ہیں جسم و جہاں میں
یہ ہم کن زلزلوں سے ٹوٹتے ہیں

بالآخر خود سے ملنے چل پڑے ہیں
ظفرؔ مکڑی کے جالے ٹوٹتے ہیں

خوش نصیب

میرے کشمیر اب تو اکیلا نہیں

عالمِ ہست میں
جتنے سینوں میں انسانیت جاگتی ہے
ترے ساتھ ہیں
جتنی آنکھوں میں سپنے بسے
روئے فردوس کے
نفرتوں سے بھرے۔۔۔۔۔اس جہاں سے پرے
جن میں احساس کی روشنی ہے
ترے ساتھ ہیں

اب ترے ہاتھ میں وہ بھی ہاتھ ہیں

ہر زمانے میں جو

تھام لیتے ہیں ظالم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو

جن میں اب بھی بڑی زندگی ہے

ترے ساتھ ہیں

آج صوتِ لہو

تیری وادی سے باہر بھی آنے لگی

کو بہ کو

سب کو بیدار کرتی ہوئی

ہر ارادے کو تلوار کرتی ہوئی

دیکھ لے اپنی آنکھوں سے تو

ہر افق اب شفق میں نہانے لگا

عارضِ وقت بھی تمتمانے لگا

اپنی بانہوں میں سر دے کے سوئے ہوؤں کو بھی اب ہوش آنے لگا

دُور تک جن کو میری نظر دیکھتی ہے

ترے ساتھ ہیں

میرے کشمیر اب تو اکیلا نہیں

منزلِ ما دُور نیست

اِک معرکہ جاری وہاں پر بھی ہے جبر و صبر میں

شعبِ ابی طالب بنی ہے وادیٔ کشمیر بھی

جب خون رنگ لانے لگے، سب کو نظر آنے لگے

نزدیک سے نزدیک تر آزادیٔ کشمیر بھی

کہانیاں مجھے اپنی سُنا کے چلتے بنے
ستم ظریف تھے، پتھر بنا کے چلتے بنے

وہ بات میرے گناہوں میں لکھی جا بھی چکی
وہ راز کی طرح جس کو چھپا کے چلتے بنے

بس ایک گمرہی ہے، جس نے ساتھ نہ چھوڑا
بہت سے راستے منزل دکھا کے چلتے بنے

میں کیا بتاؤں کہ جھونکے تھے کن ہواؤں میں
مجھے بکھیر کے، تجھ کو کھلا کے چلتے بنے

میں رنگ رنگ کے موسم پہن کے بے رنگا
مثالِ آب وہ خود میں ملا کے چلتے بنے

یہ دنیا ایک جہاں تھی ہمارا، اس میں بھی
مسافروں کی طرح آئے، آ کے چلتے بنے

فنا نے جیسے گجر ہجر کا بجا دیا ہو
"ہمارے شہر سے بندے خدا کے چلتے بنے"

کھڑا ہوا ہوں میں کس عمر کے دوراہے پر
وہ کس کے خواب تھے جو ساتھ لا کے چلتے بنے

اُدھر میں گیتی شب میں ستارے بوتا رہا
اِدھر سے میرا سورج اُٹھا کے چلتے بنے

میں جان بوجھ کے مفتوحہ بن گیا تھا مگر
وہ لوگ تو میری دنیا اُٹھا کے چلتے بنے

میں گوندھتا رہا بیکار اپنی مٹی میں
ظفرؔ سبھی تھے مسافر خلا کے، چلتے بنے

یونہی ہمک رہے ہو خیالو! زمین پر
تم آسمان کو ہی بلا لو زمین پر

تیری ہی مٹی کر دے اُڑن طشتری اِنہیں
اک روز اپنے خواب اچھا لو زمین پر

میں ایک ہی زقند سے چھو لوں گا آسماں
زیرِ زمیں ہوں، مجھ کو نکالو زمین پر

جو آسماں نژاد ہیں، اُتریں گے کیوں بھلا
ذرّوں کو ہی ستارے بنا لو زمین پر

اب لوحِ آسمانی کو یکسر مٹا ہی دو
اک اور ہی کہانی اُجالو زمین پر

وہ تو زمیں کے رستے فلک پر چلا گیا
یہ کس کو ڈھونڈتے ہو سوالو! زمین پر

لے جائیں نہ اُڑا کے کہیں اور آندھیاں
خود کو گرانیوں میں سنبھالو زمین پر

مت جاؤ آسماں پہ بھٹکنے کے واسطے
ہر سمت کہکشائیں سجا لو زمین پر

ویسے تو پاؤں بھر کی زمیں چاہیئے اُسے
سارا ہی آسمان بچھا لو زمین پر

وحشت تو آسماں کی ادائے سرشت ہے
کیا کرتے پھر رہے ہو غزالو زمین پر

سمٹی ہوئی ہیں اِن میں خلاؤں کی وسعتیں
کوزوں میں اپنے خواب نہ ڈھالو زمین پر

کھولی ہوئی ہے تم نے سخن کی اگر دُکاں
بیچو نہ زہر شیریں مقالو! زمین پر

یوں آسمان والے کو راضی کرو ظفرؔ
اہلِ زمین کی کچھ دعا لو زمین پر

زندگی رائیگاں سفر تو نہ ہو
اور ہو بھی تو عمر بھر تو نہ ہو

بات جو بھی کرو، یقینی ہو
گفتگو میں اگر مگر تو نہ ہو

دو قدم تو سکون سے میں چلوں
کوئی طوفان ہمسفر تو نہ ہو

دھوپ نے آزمانا ہی ہے اگر
سرِ راہے کوئی شجر تو نہ ہو

وصف میرا تو ہے شکیبائی
ظلم کوشی ترا ہنر تو نہ ہو

جاں لڑائی ہے ظلمتوں کے خلاف
شب گزیدہ مری سحر تو نہ ہو

اب اگر ساتھ چل پڑے ہو ظفرؔ
راستے میں اِدھر اُدھر تو نہ ہو

زیست کے بیوپار میں یوں بھی خسارے تھے بہت
تیرے خوابوں کے حصص ہم نے خریدے تھے بہت

خشک پتے ٹہنیوں سے بے صدا گرتے رہے
ہاں مگر بوٹوں تلے آئے تو چیخے تھے بہت

کچھ تو اس بستی کے لوگوں سے ہوا تھا آخرش
آسماں کو دیکھتے تھے اور روتے تھے بہت

عقل کہتی تھی کہ اب آ نہ سکے گا وہ کبھی
دل مگر نگرانِ راہ تھا، اِس کو دھڑکے تھے بہت

اور کوئی بھی فسانہ ہم سے لکھا نہ گیا
حرف لوحِ ذات کے ویسے مٹائے تھے بہت

جانے اُس کے سامنے کیوں کم نما رہتے تھے ہم
اپنی غزلوں میں تو اُس کے باب کھولے تھے بہت

اِک سمے کا تعزیہ لے کر پھرے ہیں عمر بھر
یوں تو جیون کے دسمبر ہم نے دیکھے تھے بہت

زمانہ سازی ہرگز اپنی مشہوری نہیں کرتی
ہرن سے دشمنی کیا اُس کی کستوری نہیں کرتی

تو پھر یہ کام چیرہ دست ہی انجام دیتے ہیں
اگر سرکار کوئی کارِ دستوری نہیں کرتی

جکڑ لیتی ہے اکثر نیتوں کی تیرگی آ کر
وسائل کی کمی تو پیدا بے نوری نہیں کرتی

یہ ہے کم ہمتی جو راستے میں چھوڑ جاتی ہے
کسی کو بھی کبھی ناکارہ معذوری نہیں کرتی

اِسی باعث تو ہو پاتے نہیں آسودۂ منزل
ہماری جستجو ہی پوری مزدوری نہیں کرتی

بہت سے کیس دائر ہو چکے رب کی عدالت میں
حکومت اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی

کس ہمت سے جھیل رہے ہیں پت جھڑ کے صدمات درخت
بھیج رہے ہیں آنگن آنگن پتوں کی بارات درخت

اُن میں بھی جو ہاتھوں میں کلہاڑے تھام کے آئے ہیں
بانٹ رہے ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں کی خیرات درخت

میں نے تو بس پوری کی ہے گھر کے ایندھن کی حاجت
مجھ کو کیا معلوم، رہے ہیں کن کن کے صدقات درخت

یہ تو بس انسان ہی ہیں جو زہر بھی ہیں، تریاق بھی ہیں
کچھ بھی تو دامن میں نہیں رکھتے ہیں جز ثمرات درخت

بادِ صبا کی لے پر ہی کب تالی بجاتے ہیں پتّے
آندھی میں بھی جھوم کے گائیں موسم کے نغمات درخت

دُھوپ میں اِس کی چھاؤں کے نیچے آجاتی ہے سانس میں سانس
کیسی کیسی گیسوں سے زہراب بھرے تھے رات درخت

اِس نے میری نسلوں کو آغوش میں لے کر پالا ہے
مانوں تو پھر کیسے مانوں سانپوں کی ہیں گھات درخت

میرے گھر میں میرا کنبہ شاد رہے آباد رہے
میں، میری بیوی، دو بچے اور آنگن کے سات درخت

اِسی لئے میں اِس سے گھنٹوں تیری باتیں کرتا ہوں
دیکھ چکا ہے تیرے میرے پیار کے سب لمحات درخت

ازل سے جبرِ مسلسل کی داستاں کشمیر
لہو لہو میری وادی، دھواں دھواں کشمیر

دکھائی دیتا نہیں منصفانِ عالم کو
زمیں کے نیچے ہے کیا تیرا آسماں کشمیر

اگر نہ عالمِ اسلام ہی کھڑا ہو گا
تو کس کا تھامے گا داماں پئے اماں کشمیر

وہ راستہ کہ جو تاریخ نے بچھایا ہے
اک حوصلے سے ہے اُس پر رواں دواں کشمیر

یہ تیر بن کے لگے گا عدو کے سینے پر
دھرا ہے وقت نے لا کر سرِ کماں کشمیر

کبھی عروسۂ آزادی پائے گا یہ بھی
تبھی ہے پون صدی سے جواں کشمیر

کسی کی حرص و ہوس ہے، کسی کی غیرت ہے
کہ مسئلہ تو نہیں اپنے درمیاں کشمیر

نہیں ملا تو ادھورا رہے گا پاکستان
یہ میرے قلب کی دھڑکن، یہ میری جاں کشمیر

اگر نہ جاگی یہ دنیا تو چشموں کی صورت
ابل پڑیں گے نہ جانے کہاں کہاں کشمیر

ضمیر والوں کے نطق و بیاں میں گویا ہے
رہا نہیں ہے اب اِتنا بھی بے زباں کشمیر

افق افق سے نویدِ سحر کی لو پھوٹے
فجر کی سُن کے اب اُٹھنے لگا اذاں کشمیر

لہو سے سینچا ہے اس کو بہت سی نسلوں نے
ظفرؔ ہے فصلِ گل و لالہ کا جہاں کشمیر

وہ آتے ہیں اب کس لئے
دکھاتے ہیں چھب کس لئے

ہمیں نیند آتی نہیں
بچھاتے ہیں شب کس لئے

وفاؤں کی کیا ماہیت
بناتے ہیں ڈھب کس لئے

جو پینا پلانا نہیں
تو جاتے ہیں پب کس لئے

سخن میں بھی ہے خامشی
ہلاتے ہیں لب کس لئے

مصیبت میں کوئی نہیں
یہ ناتے ہیں سب کس لئے؟

نہیں ساتھ چلتے ظفرؔ
بلاتے ہیں تب کس لئے

بہت سی زیست رہی خد و خال سے باہر
نکل گئی ہے مگر ماہ و سال سے باہر

کسی کی یاد کا جھونکا مجھے بھی چپکے سے
چُرا کے لے گیا موجِ خیال سے باہر

یوں آج تیرا رُخِ برہنہ دکھائی دے
کہ جیسے چاند ہو بادل کی شال سے باہر

وہ لاجواب مرے سامنے کبھی نہ ہوا
جواب سارے دیے ہیں سوال سے باہر

سو سیلِ عشق بہا گیا ہے ہم کو بھی
کبھی رہا ہے قلندر دھمال سے باہر؟

میں اپنی ذات کے سب خلیے توڑ کر آتا
مجھے بلاتا وہ اپنی مثال سے باہر

ہزار دام بچھائے تو تھے زمانے نے
مگر میں پکڑا گیا اُس کے جال سے باہر

خدا کی دھرتی پہ ہیں درد مشترک سب کے
زمین ڈھونڈ کوئی اشتمال سے باہر

ہنوز کاکلِ یاراں ہے میرے شانوں پر
ظفرؔ اگرچہ ہوں میں سات سال سے باہر

مکتوب
(سانیٹ)

ایک مدت سے مرے کان لگے ہیں در پر
منتظر ہے تیرے قدموں کی یہ چوکھٹ میری
ایک مدت سے نہیں آئی ہے آہٹ تیری
ایک مدت سے ہے اجڑا ہوا جیسے منظر

یوں نہیں ہے کہ تڑپتا ہے فقط دل میرا
یوں نہیں ہے تجھے مطلق میری پرواہ نہیں
مجھ کو معلوم ہے، ایسا نہیں، واللہ نہیں
ہجر کی آگ سے دل کرتا ہے جھلمل تیرا

کوئی صورت ہی نکلتی نہیں ملنے کی مگر
کوہِ حالات نے روکا ہوا ہے دونوں کو
وقت نے مٹھی میں بھینچا ہوا ہے دونوں کو
نہ کبھی رات کٹی کوئی، نہ دیکھی ہے سحر

بھیج دیتا کوئی مکتوب ہی گزری راتوں
کسی سہمے ہوئے آوارہ گماں کے ہاتھوں

زندگی بھر کے سفر کا یہی حاصل نکلا
میں کہ جس گھر سے چلا تھا، میری منزل نکلا

دنیا والوں کو سمجھتا رہا دشمن ناحق
مجھ میں جو "میں" تھا وہ آخر میرا قاتل نکلا

دے گی دستک ترے دروازے پہ دل کی دھڑکن
تیرا دیوانہ جو اِس باب میں بزدِل نکلا

کہکشاؤں کے فسانوں پہ ہنسا کرتا تھا
لو اِسی دل میں بھی ہنگامۂ جھلمل نکلا

آنکھ ہے کہ اُسی رستے پہ جمی رہتی ہے
خود کو سمجھانا بھی اب کے بڑا مشکل نکلا

کام آیا ہوں ترے عذرِ گنہگاری میں
شکر صد شکر کہ میں بھی کسی قابل نکلا

عمر بھر جس سے گریزاں ہی رہا میں نادان
اُسی گرداب کے سینے میں ہی ساحل نکلا

اولاً وعدوں کا مت بوجھ اُٹھایا کیجے
وعدہ کرتے ہیں تو پھر اُس کو نبھایا کیجے

چاند کا سارا سفر کاہکشاہوں کا نہیں
چاند کے ساتھ بہت دُور نہ جایا کیجے

دشت میں پھول کھلانے کی تدابیر کریں
شہر میں دشت نہ لا لا کے بچھایا کیجے

سنئے پیغام کیا دیتے ہیں شجر راہوں کے
دھوپ میں جلئے مگر اوروں پہ سایہ کیجے

دیکھتے رہنا ہے امواج کی وحشت کب تک
پار جانا ہے تو کچھ دل کو بڑھایا کیجے

کسی تخلیق میں عجلت کے برش مت پھیریں
چاک پر خود کو بھی تادیر گھمایا کیجے

لوگ دیں گے مجھے بے راہ روی کا طعنہ
ہر حسیں چہرے میں جلوہ نہ دکھایا کیجے

زلزلے ہیں کسی پیشانی کی شکنوں میں بہت
دل کی بوسیدہ عمارت کو بچایا کیجے

آپ کا راستہ تکتا ہے کوئی گھر میں ظفرؔ
ہر مسافت میں تو گم ہو کے نہ آیا کیجے

آزمایا کر مگر اِتنا نہیں
صبر پتھر ہی بنا دیتا نہیں

یوں تو جی سکتا ہوں میں تیرے بغیر
ہاں مگر ایسا کبھی سوچا نہیں

ہجر تھا یا جوہری بم کا مآل
دل میں اب جذبہ کوئی اُگتا نہیں

سرسراہٹ ہے مرے اوہام کی
جھاڑیوں میں سانپ تو دیکھا نہیں

دشت جیسی تھی اگر تشنہ لبی
کیوں مرے ساغر میں پھر دریا نہیں

جس طرف جاتا ہوں، چل دیتا ہے ساتھ
خود کوئی رستہ کہیں جاتا نہیں

آج بھی تجھ سے ہے امیدِ وفا
یہ نشہ پوری طرح ٹوٹا نہیں

نیند کیوں کروٹ بدل کر سو گئی
رات نے بانہوں میں کیوں بھینچا نہیں

شہر ہے جنگل مکانوں کا ظفرؔ
آدمی جیسے یہاں رہتا نہیں

ایمان سا وعدہ ہی مراسم میں نہیں ہے
تصویر تمھاری ابھی البم میں نہیں ہے

کس طور سے بچھڑے ہیں کہ چہرے پہ کسی کے
وہ رنگ بھی دیکھا ہے جو عالم میں نہیں ہے

ہر چند اُسی سے ہے جراحت کی توقع
وہ شخص مگر صیغۂ مرہم میں نہیں ہے

اوروں نے پرو رکھا ہے زنجیر میں مجھ کو
اپنا تو کوئی غم میرے ماتم میں نہیں ہے

بیٹے نے اگر باپ کی پگڑی نہیں پہنی
لاریب وہ ہم سے ہے مگر ہم میں نہیں ہے

درکار ہے بیکار مجھے دل کا سکوں بھی
یہ رنگِ بہاراں ابھی موسم میں نہیں ہے

کیا جنگ کریں شب سے اجالوں کے سپاہی
سورج ہی اگر وقت کے پرچم میں نہیں ہے

اک عمر سے محصور کیے ہے کوئی سودا
کہنے کو کسی کارِ مقدم میں نہیں ہے

ہر لمحہ مرے دل کو بھرے جاتا ہے چٹکی
حالانکہ ہر اِک یوم محرم میں نہیں ہے

دلِ ناداں!

بڑا میں ہو چکا ہوں اپنے قد سے بھی
حقیقت کھل چکی رنگینیوں کی
پھر بھی جانے کیوں
غبارے والا جب بھی دیکھتا ہوں
تو
مرا دل بھی مچلتا ہے
کسی معصوم سے بچے کی صورت یہ ہمکتا ہے
انہیں رنگین خوابوں کی طرف پھر سے

جدائی فسانہ نہ دھرائے تجھ سے
مری چیخ جا کر لپٹ جائے تجھ سے

کبھی مان توڑا نہیں نسبتوں کا
ہر اک آرزو خود کو زخمائے تجھ سے

زمانے کی آنکھوں میں خوں اُترا ہو گا
یونہی ہٹ کے چلتے نہیں سائے تجھ سے

فلک بوس دیوار ہے درمیاں کی
بہت دُور رہتے ہیں ہمسائے تجھ سے

یقیناً تو اُس سے جدائی کا سوچے
اگر متفق ہو تری رائے تجھ سے

یونہی عطر بیزی کی عادت ہے تجھ کو
گلوں نے تو سیکھے ہیں پیرائے تجھ سے

ترا سچ اُنہیں کو نگلنے لگا ہے
ظفرؔ تیرے اپنے تو بھر پائے تجھ سے

شناسائے دلِ خستہ نہیں تُو
کہ دل کی چیخ بھی سُنتا نہیں تُو

میں قبرِ ہجر میں ستی پڑا ہوں
فسردہ ہے مگر اِتنا نہیں تُو

بچھڑنا بھی تجھے آیا نہیں ہے
مرے دل سے تو جا پایا نہیں تُو

تجھے ظرفِ زمانہ کی خبر کیا
کسی کے عشق میں رسوا نہیں تُو

عدم کی شہرت میں ایسا کیا ہے
کہ بہرِ سیر بھی لوٹا نہیں تُو

تری جانب سے میسج آئے خاصے
کسی میسج میں بھی آیا نہیں تُو

تجھے دیکھا ہے میں نے ہر کسی میں
کسی چہرے پہ بھی ٹھہرا نہیں تُو

تھکی ہے عمر تو جانا ہے میں نے
کہیں جاتا ہوا رستہ نہیں تُو

ترا مجھ سے گلہ شکوہ عجب ہے
دھندلکے میں سے جب نکلا نہیں تُو

غزل تیرے لئے لکھی نہیں ہے
اگر ہر لفظ میں دھڑکا نہیں تُو

اپنے بٹ جانے کا افسوس بھی ہے
آئینہ خانے کا افسوس بھی ہے

تجھ کو پانے کی خوشی بھی ہے بہت
اپنے کھو جانے کا افسوس بھی ہے

وہ جو از خود نہ ملے ساقی سے
ایسے پیمانے کا افسوس بھی ہے

میں ترے غم کو کہاں سمجھا تھا
تجھ کو سمجھانے کا افسوس بھی ہے

سب کو معلوم تھا انجامِ وفا
اور دیوانے کا افسوس بھی ہے

سرفروشی کی تمنا بھی تھی
کام آ جانے کا افسوس بھی ہے

میں نے جو کچھ بھی کہا، تجھ پہ کہا
کچھ نہ کہہ پانے کا افسوس بھی ہے

سب کے دل ایک سے دُکھتے ہوں گے
اپنے بیگانے کا افسوس بھی ہے

اجالا

دنیا میں آگہی کا

ہر باب وا ہوا ہے

عقل و جنوں کا رستہ

ہر سو سجا ہوا ہے

حیرت کا ایک منظر

اب جا بجا ہوا ہے

ہر نگری جادو نگری

ہر فن نیا ہوا ہے

سائنس کا گویا جگ میں

جھنڈا گڑا ہوا ہے

پاتال تا ہمالہ

بازیچہ سا ہوا ہے

شب ہو گئی ہے روشن

دن ماسوا ہوا ہے

فکر و نظر کا طائر

اب پر کشا ہوا ہے

مریخ ہو کہ زہرہ

اک نقشِ پا ہوا ہے

سب کچھ ہے ٹھیک لیکن

یہ ہم کو کیا ہوا ہے

جب فیض بخشِ ایماں

نورِ حرا ہوا ہے

طیبہ سے ہر کسی کو

سورج ملا ہوا ہے

پھر جانے ہر مسلماں

کیوں بے ضیا ہوا ہے

کیوں قلب و جاں میں سب کے

اِک جھٹپٹا ہوا ہے

اذہان پہ یہ کیسا

جالا تنا ہوا ہے

سوچو خدارا سوچو

کیا ماجرا ہوا ہے

اے اہلِ وطن

کب سے بیداری کا بجتا ہے گجر

کیوں نہیں ٹوٹتا یہ خوابِ کہف

کہیں دنیا ہی بدل نہ جائے

اور سوتے رہیں اصحابِ کہف

یوں کوئی میرے مقدر میں کہیں کھو جائے
جیسے منظر پسِ منظر میں کہیں کھو جائے

لے اُڑے دِل کو ترے جلووں کا تنویمِ جمال
آنکھ ملتے ہوئے جھومر میں کہیں کھو جائے

جب صداؤں پہ زمانہ نہ پلٹ کر دیکھے
کوئی خود اپنے ہی محشر میں کہیں کھو جائے

زندگی کتنی مرادوں سے دعاؤں سے ملے
اور پھر وقت کی ٹھوکر میں کہیں کھو جائے

عمر جب ریشمیں گہوارے سے اُترے تو کیوں
ہر گھڑی سینۂ خنجر میں کہیں کھو جائے

میری آنکھوں میں جدائی کے بھنور پڑ جائیں
اور وہ ریل کے اژدر میں کہیں کھو جائے

ڈوبنے لگتا ہے سورج یا نکل آتا ہے
جب افق جادۂ احمر میں کہیں کھو جائے

کہیں تنکا کے نہ بدلہ ترا خود سے لے لے
تیرا دیوانہ بھی ساغر میں کہیں کھو جائے

جس نے ڈالا ہے مجھے بھول بھلیوں میں ظفرؔ
خود بھی ایسے کسی چکر میں کہیں کھو جائے

جدا جدا ہیں سبھی، خاندان کیسا ہے
یہ فاصلہ سا سدا درمیان کیسا ہے

لہو کی اُٹھی ہوئی انگلیاں ہیں کس کی طرف
جو قتل ہو گیا، اُس کا بیان کیسا ہے

مکینِ دل ہے مگر دل کا حال مت پوچھو!
وہ مہرباں ہے مگر مہربان کیسا ہے

اُلٹ پلٹ کے وہ دنیا کو دیکھتا کیوں ہے
یہ جستجو کا نیا امتحان کیسا ہے

بتاؤ گے تو زمیں والے خاک سمجھیں گے
بلندیوں پہ یہی آسمان کیسا ہے

ہمیشہ رہتا ہے سود و زیاں کے پلڑوں میں
یہ آدمی ہے یا کوئی دُکان، کیسا ہے

فقط ہمیں پہ یہ بپتا نہیں پڑی ہو گی
ہمارے سر پہ ہی قرضِ بیان کیسا ہے

دیا نہ لفظوں کے ہاتھوں میں ایک بھی پرچم
ظفؔر یہ شیوۂ اہلِ زبان کیسا ہے

یادیں
(سانیٹ)

رات کی یہ مہیب تنہائی
گزری صحبت کے درمیاں ٹھہری
اُنہیں یادوں کی کہکشاں ٹھہری
جن کا ہر پل ہے ایک بلوائی

یوں سنہری بہت یہ رستے ہیں
جابجا ہیں سروں سے اُٹھتی ہوئی
جھاڑیاں ان گنت اوہاموں کی
جن میں رہ رہ کے سانپ ڈستے ہیں

اور یہ دنیا ایک جادو نگر
دیکھتا ہوں جو پیچھے مڑ کر میں
بنتا جاتا ہوں جیسے پتھر میں
پھر نہ لوٹا ہے جو گیا ہے اُدھر

کاہے گزرے دِنوں کو سوچوں میں
یہی بہتر ہے آگے دیکھوں میں

مجھے اُٹھ کے جانے سے وہ روک لیتا
کسی بھی بہانے سے وہ روک لیتا

بدلنا تھا تھوڑا سا نقشہ ہی گھر کا
شجر کو گرانے سے وہ روک لیتا

اگر مجھ پہ احسان دھرنا تھا اُس نے
تو پھر خود کو آنے سے وہ روک لیتا

پرندوں کا غم جس کو کھانے لگا ہے
نشانہ بنانے سے وہ روک لیتا

فقط ایک شب کا سفر رہ گیا تھا
سمے کو بہانے سے وہ روک لیتا

مجھے اُس کے غم نے تو کرنا تھا پاگل
تماشہ بنانے سے وہ روک لیتا

مسائل کو بننے نہ دیتا ستمگر
غزل میں اُٹھانے سے وہ روک لیتا

درحقیقت

فیصلہ جھانکنے نہیں دیتا
ظلم اونچی فصیل رکھتا ہے
تیری مظلومیت دُرست مگر
جبر اپنی دلیل رکھتا ہے

زماں سازی تو ہمت کرنے والوں کی بلا جانے
مقدر کو محبت کرنے والوں کی بلا جانے

کہاں، کس نے پہنچنا ہے، مسافر آپ ہی دیکھیں!
یہ علت تو قیادت کرنے والوں کی بلا جانے

اگر پنچھی نہیں ہوں گے، کریں گے پھول بوٹے کیا
گلستانوں سے ہجرت کرنے والوں کی بلا جانے

میں کس کس یاد کی پیشی کو بھگتوں گا زمانے میں
یہ جیون کو عدالت کرنے والوں کی بلا جانے

جدائی قتل کر دیتی ہے کیسے اپنے پیاروں کو
دل و جاں پر قیامت کرنے والوں کی بلا جانے

وداع کے وقت خود کو خود سے کیسے کاٹ پاؤں گا
ظفرؔ مجھ میں سرایت کرنے والوں کی بلا جانے

خداوندانِ عالم!

نہ منزل ہمیں ملنے پاتی ہے کوئی
نہ رستے ہمارے قدم چھوڑتے ہیں
ظفرؔ "حق ہمارا" تماشہ بنا ہے
نہ وہ مانتے ہیں نہ ہم چھوڑتے ہیں

رنگ و بو کا میلہ ہے، نغمگی کا موسم ہے
گلستاں کی محفل میں شاعری کا موسم ہے

دور تک فضاؤں میں سنسنی سی پھیلی ہے
آندھیوں سے پہلے کی خامشی کا موسم ہے

سب پھسلتے جاتے ہیں حوصلوں کی مٹھی سے
وقت کے بگولوں میں بے بسی کا موسم ہے

بے یقینی ایسی ہے ڈر رہے ہیں خود سے بھی
اِک عذاب ہے، یہ جو آگہی کا موسم ہے

اُس گلی کے رنگ و بو جیسے کل جہاں میں ہوں
اُس گلی سے نکلے تو بے گھری کا موسم ہے

کیوں صبا خرامی کا کُنجِ خاص ہے مرکز
یہ بہار، ہر پتے، ہر کلی کا موسم ہے

حسرتوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے ہوں گے
دل کی آنکھ سے دیکھیں، آپ ہی کا موسم ہے

ہر طرف سے منزل کے آ رہے ہیں پیغامات
راستوں کے جنگل ہیں، گمرہی کا موسم ہے

عشق کس کو کہتے ہیں کیا خبر پجاری کو
دلبری کا موسم بھی بت گری کا موسم ہے

کبھی کشتِ شب میں اُگا لو مجھے
گلِ خاور اپنا بنا لو مجھے

مری چپ بھی باتیں کرے گی بہت
اگر تم بہ رنگِ نوا لو مجھے

سفر کی کوئی تو نشانی رہے
نہ یوں پاتے پاتے گنوا لو مجھے

مسخر نہ ہو گا تمھارا قلعہ
تمھیں آ کے مجھ سے نکا لو مجھے

کسے ڈھونڈتے پھرتے ہو چاند پر
تمھاری زمیں پر ہوں، پا لو مجھے

بگولے سفر کے اُڑا لے چلیں
یوں نکلوں نہ گھر سے، سنبھالو مجھے

تمھارے لئے موجِ پایاب ہوں
بھنور میں ہوں تو کیا ہے، آلو مجھے

میں بجھ کر بھی دوں گا تمھیں روشنی
چراغِ تمنا بنا لو مجھے

ذرا دھوپ کا ہے سفر جستجو
ذرا اپنا سایہ اوڑھا لو مجھے

خریداری کر لو نئے خواب کی
دُکانِ زماں میں بھنا لو مجھے

میں ظرفِ نظر ہوں تمھارا ظفؔر
گھٹا لو مجھے یا بڑھا لو مجھے

ساون

ساون پھر سے زخم ہرے کر دیتا ہے
یادوں کی رم جھم سی اکثر ہوتی ہے
بادل نیل گگن پر گھر گھر آتے ہیں
لیکن بارش میرے اندر ہوتی ہے

احساسِ ملکیت
(سانیٹ)

پرائے دھن کی خاطر کون لڑتا ہے جھگڑتا ہے
اگر ہو اپنی دھرتی تو نچھاور اس پہ جاں اپنی
اگر ہو اپنی مٹی، رائیگانی کا ہے کیا خطرہ
نچھاور اُس پہ کر دیں ہم لہو کا آخری قطرہ
اسی کے نام لکھیں زندگی کی داستاں اپنی
قدم دیوانوں نے جب جب کسی جانب بڑھائے ہیں
تو دیکھا ہے کہ طوفانوں کے رُخ بھی موڑ آئے ہیں
وفاؤں کا مسافر تو ہمیشہ آگے بڑھتا ہے

مگر اس بات کو سمجھے کہاں ہیں کمپنی والے

ہمیشہ جو منافع کے لئے ہر کام کرتے ہیں

وہ اپنے ہر ملازم کو فقط مہرہ سمجھتے ہیں

جو اُن کی کمپنی کے واسطے مصروف ہر پل ہیں

اگر احساس عنقا ملکیت کا ہو ملازم میں

تمھیں کہہ دو! وہ ایسوں کے لئے پھر کیسے جاں مارے

کسی کی آرزوئیں اب بھی ہم میں رقص کرتی ہیں
سنہری مچھلیاں ''اِکویریم'' میں رقص کرتی ہیں

کوئی طوفاں دبا پاتا نہیں دِل کی صداؤں کو
یہ جل پریاں تو آبِ یم بہ یم میں رقص کرتی ہیں

ہماری الفتوں کو آپ نے ہلکا نہیں لینا
بہ رنگِ ہست بھی خوابِ عدم میں رقص کرتی ہیں

یہ پیغامات پہنچاتی ہیں تم تک میرے مولا کا
اگر چڑیاں تمھارے آشرم میں رقص کرتی ہیں

میں اُن پر چل کے بھی کیوں منزلوں کا ہو نہیں پایا
جو راہیں زندگی کے پیچ و خم میں رقص کرتی ہیں

تری یادیں تو جیسے بن گئی ہیں دھڑکنیں، پیارے!
یہ رقاصائیں بھی دل کے حرم میں رقص کرتی ہیں

نیامِ مصلحت میں رہ کے جن کو زنگ لگتا ہے
وہی تلواریں لہراتے علم میں رقص کرتی ہیں

امیدیں سینۂ خنجر پہ چل کر بھی نہیں رُکتیں
یہ حسرت بن کے بھی جیسے ارم میں رقص کرتی ہیں

تمھارے ہجر کی غزلیں، تمھارے وصل کی نظمیں
دلوں میں تھرتھراتی ہیں، قلم میں رقص کرتی ہیں

جو زمانے سے جدا سوچتے ہیں
کب جزا اور سزا سوچتے ہیں

شب کا جنگل تو ہے تاحدِ نظر
لے کے ہاتھوں میں دیا سوچتے ہیں

عمر تو کٹ بھی چکی تقریباً
اور جینے کی ادا سوچتے ہیں

درد کچھ دل میں سوا ہوتا ہے
جب کبھی تجھ کو سوا سوچتے ہیں

میرے بارے میں جھجک کیسی ہے
کبھی بادل بھی بھلا سوچتے ہیں

کر دیا راکھ جلا کر مجھ کو
اب بہ اندازِ صبا سوچتے ہیں

مدتوں بعد ملیں جب خود سے
آئینہ دیکھ کے کیا سوچتے ہیں

کر چکے اُن سے گلہ شکوہ بہت
اب نیا طرزِ نوا سوچتے ہیں

لے کے اُڑ جاتے ہیں پھر جال کو بھی
جب گرفتارِ بلا سوچتے ہیں

کہکشاؤں کا جہاں تذکرہ ہو
تیرا نقشِ کفِ پا سوچتے ہیں

دھوپ میں جلنا ہے آخر کب تک
اُونگتے پیڑ سدا سوچتے ہیں

اعزاء کی اِک بھیڑ ہے لیکن جب بھی تھکے ہیں
اپنے سائے سے ٹیک لگا کر ہی بیٹھے ہیں

سب کچھ جان کے بھی جانا ہے، کچھ نہ جانا
یارب! تیرے لوگ بھی کتنے کم ظرفے ہیں

تیری یاد کے سینے سے ہی لگے رہیں کیوں
ہم کو اس دنیا میں اور بھی روگ بڑے ہیں

اِک دوجے سے آگے بڑھنے کا ہے جنوں سا
اِک بے سمتی ہے اور ہم سب دوڑ رہے ہیں

صحراؤں کو بانجھ سمجھنا ٹھیک نہیں ہے
جب جب ایڑی رگڑی، چشمے پھوٹ بہے ہیں

تیرے کاندھوں والی بات کہاں ہے یارا!
یوں تو اپنے آپ سے لگ کر بھی روئے ہیں

غفلت نے ایسی بھی نیند سلایا اکثر
آگ نے دامن راکھ کیا ہے، تب جاگے ہیں

جب تک دھرتی تھا نہ لے، یہ بھول نہ جانا
ساحل کے نزدیک بھنور بھی ہو سکتے ہیں

آخر اپنی لاش پہ آہ و زاری کب تک
ہم بھی تو ہیں، روز جیئے ہیں، روز مرے ہیں

ہم نے تو ہر ربط کو ظرفِ نازک سمجھا
جن رشتوں نے ٹوٹنا تھا وہ ٹوٹ گئے ہیں

جن پر تیری میری زیست کا ایندھن چھوٹا
اُن پیڑوں کی شاخوں میں بھی سانپ پلے ہیں

کربلا

یہ مشیت کا ہے کیسا اہتمامِ کربلا
مالکانِ جامِ کوثر، تشنہ کامِ کربلا

سرخیٔ خونِ شہیداں، مطلعِ نورِ سحر
ابتدائے دورِ نو ہے اختتامِ کربلا

اِس کو پا سکتے نہیں جملہ فقیہانِ حرم
اور ہے مفہومِ سجدہ و قیامِ کربلا

تشنگی اُن کی کبھی مرہونِ ساقی نہ رہی
جن کا طالع ہو گیا ہے دورِ جامِ کربلا

حق و سچائی کا ہر نعرہ ہے نعرۂ حسین
انقلابِ نو کی ہر سرخی بنامِ کربلا

غیرتِ اسلام کی شمشیرِ عریاں کی قسم
اب کبھی خالی نہیں ہو گی نیامِ کربلا

وقت کی دیوارِ گریہ پر لہو سے لکھ دیا
کلمہ گویانِ زمانہ نے پیامِ کربلا

آج بھی خوں سے بھری ہے وقت کی جائے نماز
آج بھی محوِ امامت ہے امامِ کربلا

پھر فراتِ عصر پر پہرہ لگا ہے جبر کا
چھا گئی کشمیر کی وادی میں شامِ کربلا

سرفروشانِ وفا کی دیکھتا ہے راستہ
غزوۂ ہند کی کڑی ہے یہ مقامِ کربلا

ازسرِ نو لکھنی ہے ایمان والوں نے ظفرؔ
پوری کر کے داستانِ ناتمامِ کربلا

خود سے کیوں لڑتے تھے، کب جانتے تھے
اپنے دشمن کو تو پہچانتے تھے

برہنہ سر تھے کہاں دیوانے
خود پہ سورج کی قبا تانتے تھے

آؤ اس سال وہ کر گزریں ہم
ہر برس کرنے کی جو ٹھانتے تھے

آئینہ خانے میں کیوں آئے تھے
جب نگاہوں کا بُرا مانتے تھے

عمر کیوں بھول بھلیوں میں کٹی
دشتِ امکاں تو بہت چھانتے تھے

بھوک نے کھا لیا جن کو زندہ
کئی بقراط کئی دانتے تھے

سب جھلتے رہے اُن میں آ کر
پیڑ سائے جنہیں گردانتے تھے

جیون تمام عمر خسارا بنا رہا
سچ بولنا تو جرم ہمارا بنا رہا

اپنی شناوری کا سلیقہ بھی سیکھتا
جیسے تمھارے ڈل کا شکارا بنا رہا

ہم اپنے ہی وجود سے الجھے رہے سدا
برگد کا پیڑ یوں تو اشارا بنا رہا

کن بدگمانیوں نے لگائی تھی کتنی آگ
اِک پھول جیسا شخص شرارا بنا رہا

شائد وہ خود کو ہم سے جدا کچھ نہ لگ سکا
"شائد اسی لئے وہ ہمارا بنا رہا"

تو نہ رہا تو تیرے تصور میں جی لئے
ہر حال میں ہمارا گزارا بنا رہا

مفلس کو چاٹتی رہی ظلمت نصیب کی
اوجِ فلک پہ چاند ستارا بنا رہا

اپنے فشارِ خون نے ہم کو نگل لیا
گرداب بھی اگرچہ کنارا بنا رہا

اِک عشق ہی رہا مرا قبلہ نما ظفرؔ
یہ سانپ کاٹ کر بھی دُلارا بنا رہا

بہار کو بھی حساب و کتاب آئے گا
بنامِ صحنِ چمن انقلاب آئے گا

چراغِ دل نہ بجھیں ظلمتوں کی یورش میں
بڑھے گی شب تو کوئی آفتاب آئے گا

ہماری جرأتِ رندانہ تک ہے محرومی
اُٹھیں گے آپ تو دورِ شراب آئے گا

ہیں خار خار اگر شاخچے تو کیا غم ہے
جو بدلی رُت تو اِنہیں پر گلاب آئے گا

ہم اُن کے ہوتے ہوئے تشنہ کام بیٹھے ہیں
نگاہِ ساقی کو کچھ تو حجاب آئے گا

سب آرزوؤں کی لو کو بلند ہی رکھیں
سوال ہوتے رہے تو جواب آئے گا

اس آس پر کسی معجز بیاں کی سنتے ہیں
کبھی تو ذکرِ گناہ و ثواب آئے گا

کسی کے جلوؤں کی ٹھنڈک سمیٹنے کے بعد
ہمارے دیدہ و دل پر عذاب آئے گا

گی سب کو میری وفا مختلف
مرے ساتھ ہوتا رہا مختلف

ترے غم نے صورت بدل دی مری
یہ آئینہ تھا اِک ذرا مختلف

ترے ساتھ بھی روزگارِ جہاں
مرے بھی ہیں صبح و مسا مختلف

مرے حال سے یار مایوس ہیں
مجھے دے رہے ہیں دُعا مختلف

بس اُن ساعتوں سے ہوں میں گمشدہ
جہاں سے ہوئی تھی نوا مختلف

بتاتی ہے میری تباہی یہی
رہے ہیں مرے آشنا مختلف

ترے پیار سے بھی تلافی نہیں
مری ذات کا ہے خلا مختلف

ظفؔر میں دئے اپنے رکھوں کہاں
مرے شہر کی ہے ہوا مختلف

ملکیت

ملک صاحب!

زمیں ساری خدا کی ہے

یہ اُس نے ساری مخلوقات کی خاطر بنائی ہے

درندہ ہے، پرندہ ہے، چرندہ ہے یا انساں ہے

وڈیرہ ہے ملک ہے چوہدری ہے یا کوئی خاں ہے

یا مجھ سا کوئی کمی ہے

سبھی کا اِس میں حصہ ہے

تو پھر اس میں بھلا سرکار کا کیسا اجارہ ہے

زمیں ہے آپ کی کیسے؟

خدا نے تو صحیفہ کوئی بھیجا ہے

نہ نازل کی ہے آیت کوئی بھی ایسی

کہ جس میں آپ کو سونپی گئی ہو ملکیت اس کی

مسل نہ فرد ہے کوئی

نہ آیا ہے کوئی اسٹامپ اُس مالک کی جانب سے

(حقیقت میں وہی تو ہے جو مالک ہے زمینوں کا مکینوں کا)

زمیں والوں کے لیکھے میں

بھری دنیا کے میلے میں

مرا کچھ بھی نہیں گویا

زمیں کا کوئی ٹکڑا ہے

مکاں

نہ کوئی چھت چھپر

بدن کو نوچتے موسم

کڑکتی دھوپ پھاگن کی

برستے ابر ساون کے

سبھی نے مجھ سے پوچھا ہے
زمیں میں سے جو بنتا ہے ترا حصہ کہاں پر ہے؟
مرا حصہ کہاں پر ہے؟

تیرا اندازِ نظر بدلا ہے جاں
یا زمیں پر گر پڑا ہے آسماں

لوگ جو رستے میں تھے، سکتے میں تھے
پوچھتا کس سے نشانِ کارواں

مفلسی مہمان بن کر آئی تھی
رفتہ رفتہ بن گئی مالک مکاں

حسرتوں کی آگ نے گھیرا وہیں
آنسوؤں میں ڈوب کر ابھرا جہاں

برہنہ پائی سمیٹے گی اِنہیں
ہرطرف ہیں کرچیاں ہی کرچیاں

سایۂ سقفِ سماء پورے ہوئے
ہم نے جو دیکھے تھے خوابِ آشیاں

رنگِ دنیا دیکھتا رہتا ہوں میں
خود کو خود سے مانگتا رہتا ہوں میں

رات بھر کیوں نیند آتی ہی نہیں
چاند سے کیا پوچھتا رہتا ہوں میں

کیسا نابینا سا ہے زیست کا
سب سے آنکھیں مانگتا رہتا ہوں میں

تشنگی بجھتی نہیں اظہار کی
اپنے اندر گونجتا رہتا ہوں میں

زعم ہے پتھرائے جانے کا مجھے
اور دل کو تھامتا رہتا ہوں میں

طعنۂ لب بستگی ہے کس لئے
کچھ تو چپ میں بولتا رہتا ہوں میں

خشک پتے ہیں یا امیدیں ظفرؔ
ٹہنیوں سے توڑتا رہتا ہوں میں

جھٹپٹے میں ہی اذاں دینے لگے خوابِ سحر
آخرش آ ہی گئے اِن کو بھی آدابِ سحر

رات دروازے سے اندر نہیں آ پائے گی
میری آنکھیں مرا دل منبر و محرابِ سحر

مارتا پھرتا ہے شب خوں بڑی بے خوفی سے
لشکرِ ظلمتِ شب میں کوئی مہتابِ سحر

جب بھی مایوسی کے موسم نے چمن کو جکڑا
مسکرا دیتا ہے کوئی گلِ شادابِ سحر

نور افشانی رہی شب کے شہیدوں سے بھی
صرف سورج ہی نہیں گوہرِ نایابِ سحر

سانپ لپٹا نہیں اس پیڑ سے مایوسی کا
مضمحل ہوتے نہیں ہیں کبھی اعصابِ سحر

جادوئے خامشی شب میں کہاں آتے ہیں
گیت بُنتے ہی چلے جاتے ہیں مضرابِ سحر

تب بھی ڈالی نہ سپر معرکہ آراء دل نے
باز ہوتے ہوئے دیکھا ہے ہر اک بابِ سحر

اب کے خود اپنے لہو سے ہی بجھی تشنہ لبی
کب ملی میکدۂ وقت سے مے نابِ سحر

جلوۂ مے ناب کر دے گا شرابی کچھ نہ کچھ
شام اُس کے ہونے سے ہوگی گلابی کچھ نہ کچھ

فاتحاؤں میں نظر آتے ہیں کچھ اپنے مرے
سو شکستِ فاش بھی ہے کامیابی کچھ نہ کچھ

کیوں نکالا جا نہیں پاتا میں دل سے، سوچنا!
لایا ہوں گا ایسا اذنِ باریابی کچھ نہ کچھ

ڈوب جاتا میں یقیں کی خوابناؤں میں کہیں
پوری ہوتی خواہشِ خانہ خرابی کچھ نہ کچھ

سارے پتے ہو گئے ظاہر سبھی اطراف کے
آخرش رنگ لائی اپنی بے حجابی کچھ نہ کچھ

گھڑسواروں کی بہت ٹاپیں سنائی دیتی ہیں
کاش رکھتے جوششِ پا بہ رکابی کچھ نہ کچھ

آگہی یونہی بھٹکتی تو نہیں ہے دربدر
ہر کسی نے دی ہے اِس گڑیا کو چابی کچھ نہ کچھ

وقت کے ماتھے پہ ویسے چاند کا جھومر تو ہے
تیرے آنے سے بھی آتی ماہتابی کچھ نہ کچھ

وحشیانہ رقص میں مصروف تھے جب زلزلے
زندگی کو سوجھتی حاضر جوابی کچھ نہ کچھ

مجھ شکیبا کو ہے راہِ میکدہ ملنے کی دیر
آج سرزد ہو ہی جاتی ہے شتابی کچھ نہ کچھ

نوچتے پھرتے ہیں جو موئے مسامِ جاں ظفؔر
کاش آ جاتی اُنہیں خود احتسابی کچھ نہ کچھ

نیا سال
(سانیٹ)

ہر سال دسمبر نے ہمیں موقع دیا ہے

ہم اپنے فسانے کو نیا موڑ دکھائیں

قرطاسِ تمنا پہ نئے خواب سجائیں

پہنائیں مناظر کو دھنک رنگ قبائیں

جا جا کے سرِ دشتِ وفا پھول کھلائیں

جملوں سے گئے سال کی سب گرد اُڑائیں

لفظوں کو نئے فکر کے اعراب لگائیں

ہر بار سمے کو کوئی امید رہی ہے

ویسے تو یہی زیست کی تمہید رہی ہے
اِک جوش سے اُٹھے ہیں قدم جانبِ منزل
پر زیست کبھی ایسے تو ڈھوئی نہ گئی ہے
کب حسبِ تمنا ہمیں ہو پایا ہے حاصل
ہو جاتے ہیں حالات سے مجبور کیا کیجے
اِس مٹی میں دنیا نئی بوئی نہ گئی ہے

اِک یاد مرے دل کو نگل جاتی ہے
اِک سِل ہے جو ہر رات پگھل جاتی ہے

آنکھیں کسی رستے پہ پڑی رہ جائیں
تو عمر بھی مٹھی سے پھسل جاتی ہے

پڑتی نہیں مجھ پر ترے جلووں کی پھوار
یہ فصل تو رستہ ہی بدل جاتی ہے

رستہ سا یہ کھل جاتا ہے کیسا دل میں
کیوں نیند ٹہلنے کو نکل جاتی ہے

لینے نہیں دیتی جو ضیاؤں کو نمو
وہ رات بھی اِک روز تو ڈھل جاتی ہے

آسیب ہے مدت سے کسی کا مجھ میں
وہ کیسی خلش ہے جو نکل جاتی ہے

ہمسائے کے آنگن میں ہے مسکن اس کا
انگور کی وہ بیل جو پھل جاتی ہے

یوں جذبۂ دل کو نہیں لیتے ہلکا
بندوق کبھی آپ بھی چل جاتی ہے

ابلاغ کے کس حبس میں بیٹھا ہوا ہوں
کیوں خامشی بے طرح مچل جاتی ہے

ایک رباعی

چلاتے ہوئے لب کو سیے رکھا ہے
اِک زہرِ شکیبائی پیے رکھا ہے
کیا کیجیے ہر شب کی طرح پھر اُمشب
یادوں نے زدوکوب کیے رکھا ہے

میں بھی کھوتا جا رہا ہوں تھوڑا تھوڑا دن بدن
جیسے خود میں ہی اُترتا جائے دریا دن بدن

کچھ تو دنیا کی ہوا دے خود کو، ورنہ دیکھ لے!
زنگ آلودہ ہوا جاتا ہے تالا دن بدن

ہائے اب تو جیتے جی اہرام بن کر رہ گیا
رنگ کیسا چڑھتا جائے تیرے غم کا دن بدن

پر کتر پائی نہیں ہے نارسائی بھی کوئی
بڑھتا ہی جاتا ہے میرے سر کا سودا دن بدن

روشنی تقسیم کرنے والوں کو کب تھا گماں
یوں سبھی آنکھوں میں پھیلے گا اندھیرا دن بدن

اُٹھتا جاتا ہے خلوص و دوستی سے اعتبار
ہوتا جاتا ہوں زمانے سے شناسا دن بدن

میری بیلوں نے بڑھایا اُس کی جانب ہاتھ کیا
ہو رہا ہے اور اونچا اور اونچا دن بدن

تو نے کھودا تھا جہاں آتش فشاں دل کا ظفرؔ
پھیلتا جاتا ہے اُس بستی کا لاوا دن بدن

لبِ سخن سے لگا تھا ایاغِ میخانہ
سو نور افشاں ہے ہر سو چراغِ میخانہ

یہ رہگذار اُنہیں کیا اُٹھا کے لے جائے
ملا نہ رند سے جن کو سراغِ میخانہ

بہت دنوں سے فقیہانِ شہر ہیں خاموش
ٹھکانے پر نہیں رہتا دماغِ میخانہ

ہما ہی رہے رندانِ کج کلاہاں کی
ہرا بھرا رہے داغوں سے باغِ میخانہ

بھنور نے ساحلِ جاں پر پڑاؤ ڈال لیا
نہ نکلی کہر سے اب تک اُلاغِ میخانہ

تمام عمر مباہی رہی حیات اِس پر
مٹا نہیں کبھی دامن سے داغِ میخانہ

خدا کا شکر، میسر ہے صحبتِ یاراں
ظفؔر ملے نہ ملے پھر فراغِ میخانہ

وادیٔ کشمیر

کھیل کیا جمہور سے یہ ارضِ جمہوری میں ہے
ساری وادی محوِ اِک طالع کی مزدوری میں ہے
سینکڑوں روزوں سے محصوری میں، مجبوری میں ہے
رات بھی ہے تیرگی میں، دن بھی بے نوری میں ہے
زندگی گویا سبھی کی اِک کڑی تعزیر ہے

ہائے کیا جور و ستم ڈھائے ہوئے ہیں روز و شب
جیسے دیواروں میں چنوائے ہوئے ہیں روز و شب
پنجۂ ظلمت میں الجھائے ہوئے ہیں روز و شب
برف زارِ شب میں کفنائے ہوئے ہیں روز و شب
مدتوں سے دست و پا میں جبر کی زنجیر ہے

یوں تو رُک پائے نہیں ظلم و ستم کے سلسلے
اہلِ ایماں نے مگر ہارے نہیں ہیں حوصلے
لیتے ہیں انگڑائیاں گویا رگوں میں زلزلے
پھوٹتے کو ہر طرف سے ہیں لہو کے زمزمے
خامشی بھی ہے تو جیسے نعرۂ تکبیر ہے

اور ہی ہوں گے جو اِن حالات میں ڈر جاتے ہیں
آتشِ دل کو یہ جھونکے اور بھی بھڑکاتے ہیں
ساری وادی میں بغاوت کے علم لہراتے ہیں
دیکھنا ہے یہ اندھیرے کب وداع ہو جاتے ہیں
صبحِ نو کی روشنی آزادیٔ کشمیر ہے

سحرِ خاموشی میں ہے طوفان خوابیدہ کوئی
ابر میں کب تک رہے گی برق پوشیدہ کوئی
لانے کو افرشتے ہیں امداد نادیدہ کوئی
لڑکھڑا کے گرنے کو ہے سوچ بوسیدہ کوئی
خواب آنکھوں میں ہے لیکن صورتِ تعبیر ہے

ذکر ہم جیسے رندوں کا ہے غالباً، اپسراؤں کی باتیں بتاتے ہوئے
آپ کا تذکرہ بھی کیا جائے گا پارساؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

جانے وہ کیوں گرجنے برسنے لگے شانتی کی کہانی کے اِک موڑ پر
جانے ہم بھی کیوں خاموش سے ہو گئے بے نواؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

جو ہتھیلی کے نقشے کو تبدیل کر کے فلک بوس ٹاور کھڑے کر گیا
اُس کے لہجے میں حسرت سی کیوں آ گئی اپنے گاؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

یہ جو اُن کی حفاظت کے ہتھیار ہیں، اب اُنہیں کی ہلاکت کو تیار ہیں
لوگ خود ہی جراثیم بننے لگے ہیں وباؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

کیا کہیں کس ہوا میں رہے تب تلک، نہ زمیں زیرِ پا تھی نہ سر پر فلک
اپنی دھرتی کا قصہ سناتے ہوئے یا خلاؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

یہ وہ رشتوں کی بیلیں ہیں جن سے سدا ہم نے دیکھا ہے روحوں کو سرسبز سا
جوئے خوں سب کی آنکھوں سے جاری ہوئی اپنی ماؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

برش سارے ہی رنگوں میں پھیرا ہے تو اپنی تصویر کو دی صداقت کی لو
ذکر ڈستی ہوئی دھوپ کا بھی کیا ٹھنڈی چھاؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

سامنے کیسا منظر روانی کا تھا، ریت پر وہم کیوں ہم کو پانی کا تھا
رہزنوں کا خیال آ گیا کس طرح رہنماؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

ساربانوں کے سب قافلے جا چکے، گزرے ادوار کو راستے جا چکے
ہم بھی رخشِ زماں پر ہیں محوِ سفر اِن کتھاؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

کیا خبر داستاں کے کسی موڑ پر چھیڑ دے درد کا ساز کون آن کر
دھر لیا کرتے ہیں ہاتھ دل پر ظفؔر دلرباؤں کی باتیں بتاتے ہوئے

سر سے گزرے عبث سحاب کئی
ہم کو گھیرے رہے سراب کئی

زندگی ... جیسے بجتے ہی جائیں
مختلف صوت کے رباب کئی

عشق بھی تو اِسی میں شامل ہے
جن گناہوں کے ہیں ثواب کئی

تھا وقوعہ بھی ایک، سوال بھی ایک
مل رہے ہیں مگر جواب کئی

اُن کا چہرہ فقط نقاب نہ ہو
جن کے چہروں پہ ہیں نقاب کئی

معجزوں پر یقین کتنا ہے
ریت میں بو دیے ہیں خواب کئی

کرتی جاتی تھی جستجو تنہا
تکتے جاتے تھے ہم رکاب کئی

تیرے غم سے ذرا نمٹ تو لوں
اور آنے کو ہیں عذاب کئی

تیری جانب ہی کیوں اُٹھی اُنگلی
کر گئے عاقبت خراب کئی

موسموں سے ملی نہیں مہلت
مسکراتے یہاں گلاب کئی

بھید بوجھو گے کیا دلوں کے ظفرؔ
اِن کتابوں کے انتساب کئی

وقت کی ایسی عدالت دیتے
تنگ نہ آئے ضمانت دیتے

اُس کے غم کے سوا کچھ دل میں نہ ہو
اِتنی توفیقِ طہارت دیتے

اب جو سمجھے مجھے دنیا سمجھے
تھک گیا اپنی وضاحت دیتے

خود سے بھی خاص توقع کیا ہو
آئنے بھی مجھے حیرت دیتے

اُس کو دے دیتے زمانہ سارا
اور خود اُس کی بدولت دیتے

میں بھی بے دخل ہوں اوروں کی طرح
کچھ مجھے زعمِ محبت دیتے

کچھ تیقن تو زمیں پر ہوتا
چاند کو سیر کی دعوت دیتے

کیسی بیساختگیوں پر قدغن
اِن غزالوں کو تو وحشت دیتے

کبھی بن جاتے جو عشاق خدا
مارنے والوں کو جنت دیتے

ٹھیک ہے، کشتی نہیں میرے لئے
پانیوں پر تو سکونت دیتے

زور و زر والے بہت مفلس ہیں
کچھ اِنہیں درد کی دولت دیتے

تم ستم سے نہ بھلے باز آتے
مسکرانے کی اجازت دیتے

ابھی وقت ہے

(سانیٹ)

ابھی دِن ڈھلا ہے، ابھی شام کے سائے گہرے نہیں ہیں، ابھی وقت ہے

ابھی تک فضاؤں میں بکھری ہوئی ہے دھنک آرزو کی، اُفق تا اُفق

ابھی سب کو مبہوت کرتے ہوئے رنگوں والی کئی تتلیاں اُڑتی ہیں

چمن در چمن جادو کرتی ہوئی خوشبوؤں کی کئی ٹولیاں پھرتی ہیں

ابھی تک ہے دامانِ آفاق روشن، ابھی تک یہاں پھوٹتی ہے شفق

ابھی تک نہیں جستجو ماندہ پا، بارِ سر کو اُٹھائے ہوئے ہے عُنق

ابھی خواب زندہ ہیں اور سارے ہی زندہ لوگوں کی آنکھوں میں بیدار ہیں

قدم اُٹھ رہے ہیں، ابھی قافلے والے ٹھہرے نہیں ہیں، ابھی وقت ہے

ابھی راستے زندگی کی توانا صداؤں سے گونجے ہوئے ہیں، سنو!
ابھی تو تمنا غبارِ رہِ شوق میں کھو نہیں پائی ہے، میری جاں!!
کسی پردۂ چشم پر جمنے پایا نہیں ہے سلگتے سمے کا دھواں
اندھیروں کے اژدر نے نگلے نہیں کائناتِ یقیں کے زمین و زماں
فضا سرمگیں ہوتی جاتی ہے لیکن نظر آ رہا ہے ابھی آسماں
اجالوں کی نگری کے رستوں پہ ظلمت کے پہرے نہیں ہیں، ابھی وقت ہے

حوادث یونہی سر آئے ہوئے تھے
ابھی چھٹی پہ گھر آئے ہوئے تھے

تری آنکھوں میں خوابوں کی چمک تھی
یا تارے سیر پر آئے ہوئے تھے

سرابِ صوت نے کھینچا کہاں تھا
نجانے ہم کدھر آئے ہوئے تھے

لئے پھرتے تھے راہوں کے بگولے
بہت سے ہمسفر آئے ہوئے تھے

اُنہیں اُن کی خبر بھی کوئی دیتا
جو لے کے ہر خبر آئے ہوئے تھے

جبینوں میں رہا ایسا تیقن
کہ ازخود بام و در آئے ہوئے تھے

اِنہیں کے نام سب زرخیزیاں تھیں
مرے اندر کھنڈر آئے ہوئے تھے

بپے پرواز تھے آفاق عنقا
اگرچہ بال و پر آئے ہوئے تھے

ٹو تو ہے دنیائے افسوں زندگی اے زندگی
جانے میں بھی ہوں، نہیں ہوں زندگی اے زندگی

دیکھ لے اب کے بہا کر لے گئی ہے تجھ کو بھی
حشر سامانی گیہوں زندگی اے زندگی

ہائے کیسی چُپ لگا دی صورتِ حالات نے
آنکھ میں ساون نہ بھادوں زندگی اے زندگی

خاطرِ یاراں بساطِ دل پہ آخر کب تلک
تو کیا ہر بازی ہی ہاروں زندگی اے زندگی

ہر کوئی پتھر بنا ہے ذات کے اہرام میں
کیا کرے گی موجۂ خوں زندگی اے زندگی

راستے آسان بھی کم تو نہ ہوں گے دہر میں
چل رہی ہے تار پر کیوں زندگی اے زندگی

دمبدم تبدیل ہوتے جاتے ہیں تیرے خطوط
کیا بتاؤں، یوں ہے یا یوں زندگی اے زندگی

چھوڑ کر اپنا علاقہ سیرِ امکاں کو نہ جا
آ نہ لے سیلابِ بیروں زندگی اے زندگی

سنتا ہوں رنگین شیشوں والی کھڑکی سے لگا
گلیوں میں آندھی کی شوں شوں زندگی اے زندگی

اس پہ چل کے کون سی منزل ملے گی آخرش
سارا ہی رستہ وگرگوں زندگی اے زندگی

ٹوٹنے پاتا نہیں ہے بے حسی کا یہ سکوت
اور چیخوں؟ اور چیخوں؟؟ زندگی اے زندگی

خوابوں کی چپ لگی جو حقیقت کی ریم میں
کتنے گمان سمٹے یقیں کے فریم میں

کھویا کسی کی یاد میں تو خود کو پالیا
زندہ ہوا، مرا جب کسی کے پریم میں

مدت سے مجھ میں ایک ہی موسم حنوط ہے
نم نم سی ہیں نگاہیں کسی غم کی سیم میں

تنہائیوں میں اکثر جھلک مارتا ہے کیوں
بھولا ہوا وہ شخص تصور کی کیم میں

درکار زندگی کو نہیں اور روشنی
جب سے ترا ذخیرہ کیا دل کے ڈیم میں

اِس ڈر سے جائیدادِ وفا کی نہ بات کی
مجھ سے نہ خود کو مانگ لے اپنے کلیم میں

اِک عمر سے میسر نہیں لذتِ سحر
گم ہو کے رہ گئی ہے کہیں توس وجیم میں

میں زندگی کے نقشے کو پڑھ نہ سکا ظفرؔ
چکرا گیا ہوں سانپ و سیڑھی کی گیم میں

یاد بھی کیسی وارداتی ہوئی
چھلنی چھلنی ہماری چھاتی ہوئی

زیست چاہتی ہے کوئی شکل کہن
ہر نئے چاک پر چڑھاتی ہوئی

یہ دھڑکنے لگا ہے سب کے لئے
دل کی جاگیر شاملاتی ہوئی

مجھ کو پہروں رُلایا کرتی ہے
ایک تصویر مسکراتی ہوئی

مدتوں بعد میں ملا خود سے
اِک ملاقات تعزیاتی ہوئی

ناشناسا یہی نگاہ تھی کیا؟
ساتھ جو دور تک ہے آتی ہوئی

دیکھتا ہوں کہاں سے آتا ہوا
کیا خبر وہ کہاں ہے جاتی ہوئی

اب سبھی پر سوار ہوں میں ظفرؔ
پہلے ہر موج تھی ڈراتی ہوئی

مجھے کہکشاؤں کی خواہش نہیں
ستاروں میں میری رہائش نہیں

محبت دلوں میں اُتارے دھنک
کہ اس رُت میں خوئے نمائش نہیں

پروں کو ہے سودائے منزل کوئی
اُڑانیں پئے آزمائش نہیں

طلب ہے تری آتشِ زیرِ پا
کوئی اور مجھ میں آلائش نہیں

عجب بے نیازانہ ہے جستجو
ظفر مجھ کو فکرِ ستائش نہیں

محبت

زندگی کی ریاضی کے کلیئے
کچھ سمجھ میں نہ آ سکے ہیں کبھی
کتنے ارمانوں کی مساواتیں
جانچ کے بعد یوں ہوئی ہیں حل
کہ توقع کو ایک دھچکا لگا

اور قصہ تری محبت کا
زندگی کی کسر میں جب آیا
تو کسی قوس کی حقیقت سے
منقسم ہو کے حل ہوا ایسے
سینکڑے کو صفر بنا ڈالا

ہائے جبر و مقابلہ کا طلسم
مجھ کو معلوم بھی ہوا نہ اور
آن ٹکرا دو عنصری رشتہ
اور میرے تفاعلِ جاں کو
کسی قوت نما نے کاٹ دیا

یہ زمانہ ہے تیسرا عنصر
میرا اِس سے گلہ نہیں بنتا
تیرا میرا یہ رشتۂ باہم
غیر وحدانی ہے، چنانچہ ہے
اک عجب طور کا حسابی عمل

تجھ کو خود میں جمع کیا جب سے
خود سے تفریق ہو گیا ہوں میں

سمجھوں اِسے نہ تجھ سا فریب گمان کیا؟
یہ آسمان واقعی ہے آسمان کیا

چاروں طرف سے مجھ کو بنائیں گے سب ہدف
بے تیر ہی رہوں گا میں لے کر کمان کیا

پس منظروں سے مجھ کو مناظر دکھائی دیں
آنکھیں کرے گا اس کے لیے کوئی دان کیا

ہر پیڑ اژدھوں کا ہے مسکن بنا ہوا
اب کوئی جا کے اِن میں بنائے مچان کیا

ہر بات ہی اشاروں کنایوں میں کس لیے
آتی نہیں ہے اہلِ سخن کو زبان کیا

جس کا تقاضہ کرنے لگی ہے تری وفا
تو آپ دے سکے گا یہی امتحان کیا

یوں بھی نہ اُس کو دیکھ کے سیٹی بجا سکا
اِس بات پر کہے گا کوئی نوجوان کیا

پانی ہی سر کے اوپر سے گزرے تو کیا کروں
کشتی ہی ڈوب جائے تو پھر بادبان کیا؟

ہر لفظ کے رگ و پے میں لازم ہے کودنا؟
عنوان نہ سنائے گا سب داستان کیا؟؟

کس نے ظفرؔ کیا ہے ہمیں یوں جدا جدا
آئینے اور عکس کے ہے درمیان کیا

کوئی رُت نہ دے گی بہاروں کے قرض
فقط خود سے مانگو نظاروں کے قرض

خراجِ لہو دل کو دینا پڑے گا
تبھی پا سکو گے شکاروں کے قرض

اگر تیرے بازو ہی چپو نہیں
بھنور بھی نہ دے گا کناروں کے قرض

بھلا جشنِ سرمستی زیست سے
اُتر جائیں گے جان ہاروں کے قرض؟

ابھی دل کی دھڑکن سے کوہکن
میسر نہیں آبشاروں کے قرض

بنا پائیں گے خاک وہ کہکشاں
جو ہر شب کو ڈھونڈیں ستاروں کے قرض

ہمارے سفر پہ ہی قدغن لگی
ہمیں پر رہے رہگذاروں کے قرض

مرا ہی لہو اُن کے پیالوں میں ہے
مرے ذمے ہیں تاجداروں کے قرض

ظفرؔ نقدِ جاں سے بھی مکتے نہیں
یہ کیسے ہیں جیون کے ماروں کے قرض

ہم سے جب اپنے ہی سائے کھو گئے
ہم بھی پھر سورج کے صارف ہو گئے

طے کیا ہے رات کا لمبا سفر
لے گئی جب تک دیے کی لو، گئے

سربلندی دی زمیں نے اور وہ
آسمانوں پر ستارے بو گئے

شہر بھی جادو نگر ہیں غالباً
گاؤں پھر لوٹے نہیں ہیں، جو گئے

کتنے ہنگامے درونِ در رہے
زلزلے بن کر اُٹھے اور سو گئے

چاند جیسے لوگ کس عجلت میں تھے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور ۔۔۔ وہ گئے

زندگی کے ہاتھ میں کچھ نہ رہا
سب زمانے اپنا ساماں ڈھو گئے

تھے تو رنگ و نور میں ڈوبے ہوئے
راستے سارے ہی دلدل ہو گئے

جھوٹ اور سچ کا تو قصہ ہے دگر
آئینے خود عکس میں ہی کھو گئے

رنگ لایا شہر کا موسم ظفرؔ
باد و باراں چپ مری بھی دھو گئے

کہا کس نے کہ سارا آسماں درکار ہے ہم کو
جو سر کو ڈھانپ دے وہ سائباں درکار ہے ہم کو

یونہی اِک یاد کی ہمراہی میں نکلے ہیں ہم خود سے
ٹہلنے کے لئے اِک کہکشاں درکار ہے ہم کو

سلجھتی ہی نہیں اِن راستوں کی گتھیاں ہم سے
سفر کرنا نہیں سو کارواں درکار ہے ہم کو

ذرا سے جسم میں ہم ہو گئے ہیں کتنے بے پایاں
سمندر اور وہ بھی بیکراں درکار ہے ہم کو

عبث ہے اپنی ہی پرچھائیوں سے کھیلتے رہنا
کسی نقشِ جہاں کا بھی بیاں درکار ہے ہم کو

سبھی کو چاہئیں کردار اپنے اپنے رنگوں کے
جو لکھنے والی ہو وہ داستاں درکار ہے ہم کو

کوئی اپنے سوا اُس کو نہ حاصل کر سکے ہرگز
نشاں جس کا نہ ہو، ایسا نشاں درکار ہے ہم کو

اگرچہ زندگی بھر اپنی گلچیں سے نہ بن پائی
خزاں میں پھر بھی خوابِ گلستاں درکار ہے ہم کو

چلو پھر آگے ہم جانیں، ہمارا حوصلہ جانے
گماں سا کچھ سرِ آبِ رواں درکار ہے ہم کو

کسی کی جستجو نے زندگی دلچسپ کر دی ہے
ظفرؔ بس بس یہی کارِ زیاں درکار ہے ہم کو

بھیڑ میں کھونے کی قیمت نہیں دینی آتی
اپنی تنہائی کو صحبت نہیں دینی آتی

اُس کی نظروں سے توقع تھی عبث معجزے کی
چاک پر بھی کوئی صورت نہیں دینی آتی

منزلیں ڈال کے رکھی ہیں سرِ زادِ سفر
راستوں پر کوئی تہمت نہیں دینی آتی

تول کر لیتے ہیں تاجر بھی پسینہ میرا
یہ الگ بات کہ اُجرت نہیں دینی آتی

اپنے کردار کو پہنائی ہیں تیری یادیں
اور افسانے کو فرصت نہیں دینی آتی

زندگانی کا ہر اک پل ہے تغیر کا امیں
پھر بھی روداد کو ندرت نہیں دینی آتی

روح کو لیپ دیا اُس کی محبت میں ظفؔر
حدِ فاصل بہ ضرورت نہیں دینی آتی

شہرِ آشوب

میرے شہر کو کیسی رُت نے رنگا ہے
اب کے برس تو سارے موسم ماسک پہن کر آئے ہیں
اونچے اونچے پیڑوں کے جو سائے ہیں
آسیبوں سے لگتے ہیں
اور ان پر حیرت کے پنچھی خود میں سمٹے بیٹھے ہیں
ہر سو ہو کا عالم ہے
سڑکیں بھی رہ رہ کر اُن پہیوں کا رستہ دیکھتی ہیں
جن کا چلنا
سارے دیس کی قسمت کا چلنا ہوتا ہے
میرے گھر کے سامنے والا پارک تو بالکل شہرِ خموشاں جیسا ہے
یوں لگتا ہے
عمروں کی ہر قلقاری کو اندیشوں کے اژدر نے سالم کا سالم نگلا ہے

تو کیا سارا منظر آنکھ کا دھوکہ ہے

سارے ہی گھر خوف کی بدروحوں سے بھرے ہیں

سب رشتوں کے دروازوں پر قفل پڑے ہیں

گھروں کے اندر انسانوں کا نام نہیں

اور جو انساں ہیں تو وہ بھی انساں کیا ہیں

سینٹیائزر میں ڈوبی دو سہمی سہمی آنکھیں ہیں

شہر کا ہر ہر گوشہ خوف کے، چپ کے کفن میں لپٹا ہوا ہے

رب کی اے ٹی ایم کا جال بچھا ہے

لیکن

کارڈ کسی امید کا ان میں چلتا نہیں ہے

بھول چکے ہیں کوڈ بھی ایمان کا شائد

میں جو اپنی لاش کو لے کر نکلا ہوں

تو کوئی بھی موجود نہیں دفنانے کو

اب کے غمِ فرقت بھی عجب رنگِ دگر دے
ہر پل مجھے جیسے مرے مرنے کی خبر دے

قسامِ ازل ! زیست کا کرنا نہیں مشکل
جینا مجھے آ جائے گا مرنے کا ہنر دے

ہر گام پہ رکھ دوں گا دیے نقشِ قدم کے
بستی سے اگر کوئی مجھے راہگذر دے

جس آگ میں کودا ہوں تری پہلو تہی میں
وہ آگ بھی مٹی مری برباد نہ کر دے

ساحل تو سمندر میں چلا آئے بچانے
اور میرا تجسس ہے کہ گرداب میں سر دے

کیوں تکتا پھروں رستہ میں بیلوں کی لپٹ کا
دینا ہے تو خود اپنی ہی شاخوں کا ثمر دے

یہ کیسا دیا تو نے جلا رکھا ہے گھر میں
جو ہاتھ لگاتے ہی دھواں ہونے کا ڈر دے

میں کاٹ بھی آیا ہوں ظفرؔ عمرِ تمنا
اصرار بھی کرتا ہوں وہی شام و سحر دے

دین و دنیا کیوں مخل پھر عشق کے قصے میں ہو
عمر کا سارا سفر جب دوسرے پلڑے میں ہو

جب میں خود سے لڑ جھگڑ کر میکدے میں آ گیا
تیرا عکسِ برہنہ بھی جام میں، شیشے میں ہو

عین ممکن ہے جوئے میں خود کو کھو آیا ہوں میں
میری ساری زندگی ٹوٹے ہوئے رشتے میں ہو

میں زمینوں کے سفر پر اس یقیں سے ہوں رواں
وہ ستارہ ساز ہو لیکن مرے رستے میں ہو

معرکہ آرائیاں دل والوں میں برپا رہیں
اِتنی مقناطیست رسوائی کے تمغے میں ہو

جل رہا ہوں ایک مدت سے میں جس کی آگ میں
میرے دل کا داغ بھی اُس چاند کے مکھڑے میں ہو

وشتِ جاں میں ہے کسی محمل سے ضد باندھی ہوئی
مجھ کو جو درکار ہے ٹھنڈک اِسی شعلے میں ہو

کیوں مکان و لا مکاں تسخیر کر لوں، کیا عجب
ساری پہنائی کسی کی ذات کے حجرے میں ہو

میری خود داری تری یہ بے رُخی کب تک سہے
تجھ پہ کیوں خود اپنے ہونے کا گماں ایسے میں ہو

آگہی زادِ سفر کے گمشدہ بستے میں ہے
میں کہیں آگے ہوں اور منزل کہیں رستے میں ہے

سازشوں نے کھول رکھے ہیں محل کے چور در
اور وحشت گھڑسواروں کے کسی دستے میں ہے

دل سے بھی اُس کی اگر قیمت لگائی نہ گئی
جان دے کر بھی وہ مل جائے تو پھر سستے میں ہے

کس لئے دنیا کو رنگ و بو سے برگشتہ کروں
کس طرح بتلاؤں کہ اِک بم بھی گلدستے میں ہے

بدگمانی اِس قدر بھی یار سے اچھی نہیں
بے ضرر سا کینچھوا ہے، (سانپ تو ڈستے میں ہے)

تلخیاں بانٹی ہیں اُس نے بھی بتاشوں کی طرح
خوبصورت ساری ہی دنیا سے جو ہنستے میں ہے

راستہ اگلی مسافت کا نگل جائے نہ شب
خوف خیمے کی طنابوں کو بہت کستے میں ہے

کس ظرف سے منزل کو سمجھ پائیں سبوتاژ
ہوتے ہوئے رستے میں جو خود آئیں سبوتاژ

قدموں کو بھٹکنے کی اجازت ہی نہیں ہے
ہم دائیں ہیں اور راہگذر بائیں سبوتاژ

کیا اس لئے پائی تھی تیقن کی وراثت
اِک ورطۂ حیرانی سے کر لائیں سبوتاژ

اِس گھر کو خموشی بڑی محنت سے ملی ہے
کر دے نہ اِسے پھر سے تری کائیں سبوتاژ

مشروط ضرورت سے محبت نہیں ہوتی
کج فہمی سے اب اِس کو نہ فرمائیں سبوتاژ

اِن بانجھ زمینیوں نے بھی رکھنا نہیں بھوکا
کرتی نہیں بیٹوں کو کبھی مائیں سبوتاژ

خونخوارئ عالم سے نمٹ لیں گے ظفؔر ہم
ہاں اپنے ہی ہاتھوں سے نہ ہو جائیں سبوتاژ

شب کو اِک یاد کے ناخن سے کریدا جائے
ہم نے خود کو کہاں کھویا ہے، یہ دیکھا جائے

آج بھی واقعہ پیش آیا نہیں ہے کوئی
ڈائری کھول کے یہ واقعہ لکھا جائے

کب تلک کمرے کی یخ بستگی پر کیجے بسر
صحن میں پھیلی ہوئی دُھوپ کو چکھا جائے

ذائقہ اُس کی رفاقت کا بھی مل جائے گا
اپنی تنہائی کو کچھ چائے میں گھولا جائے

روشنی دہر کی اندھا مجھے کر دے، ورنہ
کس طرح میری نظر سے تیرا جانا، جائے

کاندھا دیتے ہوئے شل ہوگئیں سوچیں اب کے
کیوں نہ اب اپنا جنازہ کہیں رکھا جائے

کسی تعمیر میں رشتوں کی ضرورت کیا ہے
سنگ و آہن سے مکاں اپنا بنایا جائے

تیرا کردار مری جان کو آیا ہوا ہے
خود کو کیا اپنی کہانی سے نکالا جائے

آئیں کچھ دیر کو برباد ہوں اِس میں ہم تم
اس سے پہلے کہ یہ دنیا کا تماشا جائے

جب تری سمت ہی منزل کو نہیں مڑنا ہے
ہم کو لے کر جہاں جاتا ہے یہ رستہ، جائے

اپنی آواز جہاں خود کو سنائی نہ دے
کس لئے جا کے وہاں زور سے چیخا جائے

ہائے اُس وقت بھی کیا رنگ تمنا ہو گا
دل سے جب خود سے بھی ملنے کی تمنا جائے

اِتنی آسانی سے عادت نہیں بدلی جاتی
وہ کہ جو حفظ رہا، کیسے بھلایا جائے

قافلے دُھول اُڑاتے ہوئے گزرے ہیں ظفؔر
خیر اندیشوں کو رستہ ہی نہ سمجھا جائے

ہر حقیقت بن گئی گویا نگاہوں کا کولاژ
آگہی لگنے لگی ہے اشتباہوں کا کولاژ

ہر سمے سے جیسے کوئی سانپ ہے لپٹا ہوا
آخرش یہ رات ہے کتنی کراہوں کا کولاژ

زندگانی کو تماشہ ہی بنا کر رکھ نہ دے
دنیا کے جھوٹے ثوابوں اور گناہوں کا کولاژ

یہ بھی بتلا دے بھلا پایاب ہم کیسے کریں
اے سمندر تیری اِن اندھی تہاہوں کا کولاژ

کون کہہ سکتا ہے کہ گزریں کہاں، برسیں کہاں
برشگالیں ابر پارے ۔ کج کلاہوں کا کولاژ

اب کسی تجسیم میں ڈھلتا نظر آتا نہیں
شہر کی اِن آتی جاتی شاہراہوں کا کولاژ

دیکھنا دیدہ وروں پر بھی نہ کھلنے پائے گا
کون سا منظر ہے اب کتنی نگاہوں کا کولاژ

آپ ہم تاریخ کہتے آئے ہیں جس کو ظفر
وہ زمانہ تو فقط ہے رزمگاہوں کا کولاژ

ہائیکو

دیکھیں دو بچیاں
سامنے ہیں پر دُور بہت
شوکیسوں کی گڑیاں

جنگلی بھی کانپیں
شہروں میں جو جنگل ہیں
کتنے ہیں سفاک

گڈھ مڈھ کل سنسار
سر کے اوپر سے گزرے
اِک کونجوں کی ڈار

بالوں پر ہے برف
سرد سمے ہیں جیون کے
اُبلے اُبلے ظرف

ڈوبے نین غزال
اب کے دسمبر نے کیسی
پہنی ہجر کی شال

ہر ہر قصے میں
بیٹھی ہے تنہائی کی
گرد سی لہجے میں

دیکھے پیاسی کونپل
نیل گگن پر تیرتے ہیں
کہیں کہیں بادل

سب ہیں محوِ سفر
گاؤں میں جیسے اُگ آئے
کانٹے دھرتی پر

پستی کی کیا انت
اور جب کوئی گرتا جائے
ڈھلوانوں کی سمت

گلی کا ہے شہتوت
اور بازار کی آنکھیں جیسے
گھورے کوئی بھوت

باغ سے جب نکلی
آ کر پھول پہ کاغذ کے
بیٹھ گئی تتلی

کھولے بھید شفق

پھر سورج کو روتا ہے

خون آلود افق

بربط کی تاریں

انگلیوں کی پوروں سے

مل کر روتی ہیں

کس رستے سے آئے

ساری گرد مسافت کی

چہرے پر مل لائے

ڈر دلداروں میں

چھپ کر کوئی سنتا ہے

چاند ستاروں میں

کا ہے کے گہنے
جب اُن آنکھوں نے تیرے
خواب نہیں پہنے

واہ ری ہجر کی شام
پیڑ پہ اب بھی کندہ ہے
اُس کا میرا نام

پھوٹ پڑیں جب بادل
منظر منظر روتے ہیں
ہو جاتی ہے جلتھل

سب اِس ڈر سے ڈار کے
کب سے ساحل کے نزدیک
گھوم رہی ہے شارک

گیت ہوئے تلپٹ
دنیا بھر میں برپا ہیں
شورش کے کنسرٹ

بھوکے دہر میں سارے
لیکن سائنس کی ترجیح میں
چاند ہیں یا سیارے

دُکھ نے چاٹ لیا
آشاؤں کی مستی میں
خود کو کاٹ لیا

گھور سمے کا جبر
مطلق توڑ نہیں پایا
امیدوں کا صبر

چُن رستوں کے پھول
خوشبو دے نہ پائیں گے
گلدستوں کے پھول

کیسا ہے یہ روگ
ثابت آئینوں میں ہیں
کرچی کرچی لوگ

ہر دل محوِ ماتم
یاد کی کوئی تربت ہے
اور مجاور ہم

رشتے برگشتہ
جذبِ باہم کی باتیں
لہجے یخ بستہ

اک دوری ہے ترکہ
ٹوٹ گئی ہے بستی کی
کڑی تھی جو مشترکہ

کلیاں ہوں یا پھول
اب افلاس کی راہوں میں
سب ہیں دھولوں دھول

اُف جیون کا لوڈ
تدبیروں سے بھی نہ ہوں
تقدیریں ڈی کوڈ

سوزِ عشق مدام
عید پہ بھی نہ بدلا جائے
دل کا یونیفارم

کیا بتلائیں یار
کیسی شب کا قصہ ہے
کہروں کہر دیوار

کیا کرلے گا جون
لگتا ہے شریانوں میں
جم سا گیا ہے خون

یوں کب سمجھوں میں
وقت پڑے تو پتہ چلے
کتنا سا ہوں میں

ماہیا جگ سارا
ہجر کی شب تو لگتا ہے
سب کچھ اندھیارا

توبہ ہجر کی شام
جادہ کرے کوئی کرن
جیون آس کا نام

ساتھ تھے لاکھوں روگ
میری قبر میں اُن کو بھی
دفنا دیتے لوگ

کس کاری برسات
میری پیاس کے آگے ہے
بادل خالی ہاتھ

ہولا ہے انسان
کون یہ تھام کے آیا ہے
ہاتھوں میں میزان

دوہے

سُن کے جنونی رہروں کے جذبوں کی چاپ
کہساروں نے راستہ دے دینا ہے آپ

تجھ کو اپنا نہ سکے جب اک عمر بِتا
پھر جیون کی ہاؤ ہو کا مقصد ہے کیا

چھوٹی نہ برجستگی، نیچی ہوئی نہ لے
اُس نے ہر دیوار میں چنوا دیکھا ہے

مجھ کو دکھلاتے رہے رستے کا ہے سب
اپنی مٹی گوندھنا اپنے بس میں کب

ہرچند تیرے سحر سے نکلوں وِقت سے
پھر سے دھنستا جاؤں میں نئی سہولت سے

اک دوجے سنگ کاٹ لیں آخر کو رو رو
دنیا کو ٹھکراؤں میں، نہ دنیا مجھ کو

کاٹے کٹتی ہی نہیں اُس کے ہجر کی رات
دوہوں شعروں میں رہی جس سے ہر پل بات

یہ کیا بس قسمت کرے آباد و برباد
خود بھی اپنے رات دن کر لیتے ایجاد

چلتے چلتے راہ میں وین سے اُترا کون
بھری بھرائی زندگی رہ گئی ڈھل کر پون

اب ہو میری زیست کی کس سے رنگ چمک
میرا افسانہ تو تھا تیری ذات تلک

دھرتی کے مالک بنے سائنس کے بھگوان
ناچ تگنی کا مگر اب بھی نچائے نان

رکھتے تو ہو دوستو! منزل کی سدھ بدھ
مڑ جاتی ہے کار کیوں اِک رستے پر خود

کب تک بیٹھیں منتظر میں اور میرا ژون
رستہ آخر کاٹ کر لے جاتا ہے کون

ہجر نے کر کے رکھ دیے روز و شب تیزاب
دل کو چبھتی آہٹیں، جسم نگلتے خواب

بیٹھے تو ہیں کھول کے ہم بوتل کا کاگ
بھلا بجھانے پائے گا لاوا کیسے آگ

گم کر بیٹھے آپ کو، کس سے ہوں شکوے
یاد سے جس کو بھولنا تھا، نہ بھول سکے

کیسے لے کے بیٹھ رہا لمبی چپ موہوب
کرنے کو تو شورشیں دل نے کی تھیں خوب

اُس کا لہجہ سرد ہے نرا دسمبر سا
جس کے ہجر کا روگ ہے جولائی جیسا

اپنی ماندہ پائی ہے کس پر ہوں برہم
چلتے میں ٹکرا گئے اپنے آپ سے ہم

ہم پہ پڑنی ہے کتنے غموں کی نظر
مسکراہٹ کا میک اپ ضروری ہوا